ایک مکان دو دیواریں
کمال احمد رضوی

ایک مکان دو دیواریں

کمال احمد رضوی

ایک تھے میاں امجد

دارجیلنگ کی برف سے ڈھکی چوٹیوں کے اُس پار نیچے ترائی میں اترتے ہی خوب صورت نارنگیوں والا باغ ملتا ہے۔ اس باغ کی لمبائی دس میل تک چلی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ندی بھی بہتی ہے جو باغ کے آگے گاؤں تک چلی جاتی ہے اور گاؤں سے ہو کر بائیں طرف مڑ جاتی ہے، پتہ نہیں کہاں۔ اس گاؤں کا نام سمتی پور ہے اور اس دریا کو پار کرنے کے لئے کشتی کا راستہ ہے جو دوسرے شہر کو جاتا ہے۔ یہ گاؤں بنگال اور آسام کا سب سے خوب صورت گاؤں ہے اور چاروں طرف سے ناریل کے قد

آور درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ ندی سے دارجیلنگ کی سفید سفید برف
سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں صاف نظر آتی ہیں اور جب صبح کا سورج پورب کی
طرف سے طلوع ہو رہا ہے تو یہ چوٹیاں چاندی کے تار سے گندھی ہوئی
معلوم ہوتی ہیں اور ان سے ایسی تیز چمک پیدا ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کی
آنکھیں چندھیائے بغیر نہیں رہتیں۔

اس گاؤں میں چھوٹے سے ناریل کے باغیچے کے بیچ میں گاؤں کا ایک
مدرسہ ہے۔ اس میں چار کمرے ہیں اور برآمدہ۔ برآمدے کے آگے
سبزے کا فرش بچھا ہوا ہے اور گرمیوں میں ناریل کے سائے میں اسکول
کے ماسٹر صاحب بچوں کو یہیں پڑھاتے ہیں۔ لڑکے گھاس پر قطار میں بیٹھ
جاتے ہیں اور سلیٹ پر ماسٹر صاحب کے بتائے ہوئے سوالات حل کرنے
میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان لڑکوں میں امجد بلا کا ذہین اور شرارتی سمجھا
جاتا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں تو اس کا دل خاک نہیں لگتا۔ اسے تو مدرسے کے
ساتھ والے باغ سے امرود اور ناریل چرانے کی دھن سمائی رہتی ہے۔

جب دیکھو ناریل کے درخت پر چڑھا بیٹھا ہے اور کچے کچے ناریل توڑ کر زمین پر لڑکوں میں پھینک رہا ہے۔ کئی دفعہ پکڑا بھی گیا تو صاف ہاتھ جھٹک کر یہ جا وہ جا۔ لڑکے اس کے ڈر سے کچھ نہیں بولتے، کیوں کہ کبھی کبھی امجد ان کند ذہنوں کے سوال حل کر دیتا۔ کسی کو ماسٹر صاحب کی مار سے بچا دیتا۔ اور کبھی کبھی ان کے لئے اونچے اونچے درختوں سے سنگترے اور مالٹے بھی توڑ لاتا جن تک وہ نہیں چڑھ سکتے تھے۔ غرض کہ امجد دوستوں کا بہت اچھا دوست تھا اور دشمنوں کا بدترین دشمن تھا، کیوں کہ جب کبھی وہ ایک لڑکے کو دوست کہہ دیتا تو اس کے ساتھ ہمیشہ اچھے سلوک سے پیش آتا اور ہر طرح کی مدد کرتا اور جن سے اس کی دشمنی ہوتی وہ انہیں کبھی منہ نہ لگاتا اور لڑکوں میں الگ بے وقوف بناتا۔ کبھی وہ ان کے منہ کو کوئلے سے رنگ دیتا اور ان پر سفیدی سے ٹیکہ لگا دیتا اور ایک لڑکے کو گدھا بنا کر اس پر سوار کر دیتا اور گلی میں بستے کو دھبا دھب بجاتا ہوا گشت کراتا۔ اسی ڈر کے مارے لڑکے اس سے دشمنی مول نہیں لیتے اور وہ چپ

چاپ اس کی ہر الٹی سیدھی اسکیم پر ’’ہاں‘‘ کہہ دیتے اور ہاتھ کھڑا کر لیتے۔ تو امجد ان سب لڑکوں کا چند ہی دن میں بہترین دوست بن گیا اور لڑکوں کی جماعت پر حکمرانی کرنے لگا۔

مدرسے کے پیچھے لالہ کاشی رام کا امرودوں والا باغ تھا۔ لالہ دراصل بڑا کنجوس آدمی تھا اور امرود کوّے طوطے کھا جاتے تھے لیکن وہ آدمی کو کھلانا حرام سمجھتا تھا۔ یہ لالہ عجیب قسم کا لالہ تھا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ ہر وقت ایک لمبا کرتہ اور ایک دھوتی پہنے رہتا اور امرود کے باغ کے ٹھیک بیچ میں بیٹھا ہوا مزے سے حقّہ پیتا رہتا۔

امجد کو لالہ سے دشمنی تھی۔ ایک دن اس نے دل میں تہیّہ کر لیا کہ لالہ کا باغ لوٹ لیا جائے، مگر سوال یہ تھا کہ دوسرے لڑکے ڈرتے تھے کیوں کہ کسی میں ہمّت نہ تھی کہ باغ کے اندر قدم رکھے اور اگر قدم رکھے بھی تو یہ ڈر کہ وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے شکایت کر دے گا اور ان پر بے بھاؤ کی پڑنے لگے گی۔

امجد چھٹی کے بعد جب ذرا شام ہوئی تو سب لڑکوں کو جمع کر کے باغ کے دوسرے کنارے پر لے گیا اور وہ آنے والی سیٹی جو اس نے آج ہی خریدی تھی جیب سے نکال کر زوروں سے بجائی۔ اس نے صبح ہی اسکول میں لڑکوں کو بتا دیا تھا کہ جب اس سیٹی کی آواز دے تو وہ کہیں بھی ہوں فوراً بھاگ کر چلے آئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس نے ابھی سیٹی بجائی اور لڑکے بستے بغل میں دبائے ہوئے بھاگے بھاگے آئے۔ امجد نے جب دیکھا کہ سب جمع ہو گئے ہیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اپنے خطرناک ارادے کا اس طرح اعلان کیا۔

"آج شام کو لالے کا باغ لوٹنے کا پروگرام ہے بھائیو۔"

لڑکوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ ایک دوسرے کا حیرت سے منہ تکنے لگے۔ آخر اتنا خطرناک کام کس طرح ممکن تھا اور پھر ان کے سامنے لالہ کا لمبا چوڑا دیو کی طرح جسم پھر گیا جو ناریل کے درخت کی طرح لمبا اور تنگڑا تھا اور جو بچّوں کو مچھلیوں کی طرح پکڑ کر انہیں جان سے مار ڈالتا

اور پھر اگر وہ بھاگنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو لالہ ان میں سے ایک ایک کو پہچانتا تھا اور وہ فوراً ان کی ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیشی کر کے انہیں ایک ٹانگ پر کھڑا کرا دیتا اور پھر ان کا جسم ماسٹر کی بید کے خوف سے لرز گیا۔ خوف سے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ امجد نے فوراً تاڑ لیا کہ یہ سب ڈر گئے ہیں۔

"مگر باغ میں جائے گا کون؟" احمد نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"ہاں بھائی رات کے وقت باغ میں جائے گا کون۔ سانپ بچھو بھی تو ہوتے ہیں۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

"باغ میں جانا کون سا مشکل کام ہے کوئی چلا جائے۔" امجد بولا۔ "احمد تو ہی چلا جا۔"

"نہ بابا۔ وہ لالہ ویسے ہی میرا دشمن ہے، مجھے تو جان سے مار ڈالے گا، اصغر کو بھیج دو۔"

اصغر بولا۔ ”کیوں۔ کیا میں ہی قربانی کا بکرا ہوں۔“

امجد نے کڑک کر کہا

”میں جاؤں گا باغ میں پہلے۔“

اور یہ کہہ کر اس نے فوراً قمیص کے اندر سے ٹٹول کر ایک چمکتی ہوئی چیز نکالی۔

”ارے باپ رے۔“ اصغر چیخ پڑا۔

”یار یہ کیا ہے۔“ احمد بولا۔

”ابے چھُرا ہے چھرا۔۔۔ چھرا نہیں دیکھا کبھی؟“

امجد نے چھرے کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا اور لڑکوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی چھرے سے امجد کی انگلیاں کٹ کر خون میں تر ہو جائیں گی۔

لیکن امجد بے پروائی کے ساتھ چھرے سے اس طرح کھیلتا رہا جیسے وہ کوئی

چھرا نہ ہو بلکہ بچوں کا جھنجھنا ہو۔

”اگر لالہ ذرا سا بھی اکڑا تو یہ چھرا اس کے پیٹ میں اتر جائے گا۔ سُن لیا۔“

امجد گرج کر بولا۔

لڑکے خاموش ہو گئے۔ ان سے کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ اگر امجد کے خلاف انہوں نے کوئی بھی بات زبان سے نکالی تو وہ جانے کیا کر دے گا۔ وہ چپ چاپ کھڑے ہوئے اسے چھرے سے کھیلتے ہوئے دیکھتے رہے اور اس کے حکم کے منتظر رہے۔ امجد نے جب پوری طرح محسوس کر لیا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے حکم کے خلاف ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تو اُس نے چھرے کو قمیص کے نیچے پاجامے کے نیفے میں چھپا لیا۔ لڑکے بدحواس ہو گئے کہ یہ ننگا چھرا اس نے کس طرح پاجامے میں رکھ لیا۔ کہیں اس کا پیٹ ہی نہ کٹ جائے، مگر ان میں ہمّت نہ ہوتی تھی کہ وہ امجد سے اس کے بارے میں کچھ پوچھیں۔

”تو سنو!“ امجد بولا۔ ”ہم لوگ باغ کی پچھلی طرف سے داخل ہوں گے اور

ہر لڑکے کو اجازت ہے کہ کچے پکے جتنے امرود ہوں وہ توڑ توڑ کر زمین پر پھینکتا جائے اور جتنا کھا سکے کھالے۔ مگر کسی کو یہ اجازت نہیں ہو گی کہ پھل کھانے میں اتنا مگن ہو جائے کہ لالہ اسے آ کر پکڑ ہی لے۔ لٰہذا کھائے کم اور گرائے زیادہ۔"

اس کے بعد امجد نے قمیص کی آستین کو اوپر چڑھایا اور پاجامے کے پائینچوں کو موڑ کر پوراوا سکوڈی گاما بن گیا۔

"دیکھنا یارو۔" امجد پھر بولا۔ "باغ میں جب سیٹی بجاؤں تو سمجھنا کہ خطرہ ہے اور لالہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور فوراً تم لوگ باغ کی دوسری طرف والی چار دیواری کے پاس پہنچ جانا اور میں کندھے پر اُٹھا اُٹھا کر تمہیں باہر پھینک دوں گا۔ چار دیواری کی اس طرف لمبی لمبی گھاس ہے چوٹ نہیں آئے گی، مگر یاد رکھو سیٹی کے بجتے ہی بھاگ کھڑے ہونا۔۔ بس! اب ریڈی۔۔۔ سیٹی بجتے ہی اندر۔۔۔!"

امجد نے زنجیر سے لٹکتی ہوئی سیٹی کو نکال کر منہ سے لگا لیا۔ اتنے میں

دوسرے لڑکے بستوں کو گھاس میں چھپا کر فوراً آستین اور پائینچے چڑھانے لگے اور دوسرے ہی منٹ میں سیٹی کی آواز اندھیرے میں گونجی اور دھب دھب دوڑنے کی آواز آنے لگی۔

شام کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی اور امرود کے درخت تاریکی میں لپٹے ہوئے تھے۔ پرندے کہیں کہیں ڈالوں میں پروں کو پھڑ پھڑانے لگتے ورنہ تمام خاموشی تھی۔ البتہ باغوں کے بیچوں بیچ ایک لالٹین جل رہی تھی اور اس کی روشنی میں لالہ ایک کتاب میں آنکھ گاڑے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی کھاٹ کے پاس ایک کتّا بھی بیٹھا تھا جو ذرا ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ لالہ کتّے کو باغ کی رکھوالی کے لئے رات کو اپنے پاس ہی سُلاتا تھا۔ کیونکہ اب اس کی آنکھ کمزور ہو چکی تھی اور اسے رات کو بہت کم نظر آتا تھا۔ کتّا اتنا وفادار اور چوکنّا تھا کہ رات کے وقت مسافر بھی باغ کی طرف سے گزرتے ہوئے ڈر جاتے تھے اور وہ بھونک بھونک کر باغ میں اپنی موجودگی کا بار بار اعلان کرتا رہتا تھا۔ اس وقت کتّا

چپکا بیٹھا مالک کو دیکھے جا رہا تھا جو آپ ہی آپ پڑھتے پڑھتے ہنسنے لگتا اور کبھی خاموش ہو جاتا۔

اندھیرے میں درختوں کی ڈالیوں کے ہلنے کی زور زور سے آواز آئی اور ایک خرگوش تیزی سے بھاگتا ہوا لالٹین کی روشنی میں نظر آیا۔ کتّا اس کے پیچھے بھوں بھوں کرتا ہوا بھاگنے لگا۔ درختوں کی ڈالیاں ہلنی بند ہو گئیں۔ البتہ کبھی کبھی اندھیرے میں کوئی درخت کی پھنگ کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنائی دے جاتی۔ خرگوش بھاگتا ہوا باغ کی دوسری طرف چلا گیا اور کتّا بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ لالہ جو ابھی تک کتاب پڑھنے میں مصروف تھا، ذرا سی گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت ہل رہا ہو۔ ٹھیک اسی وقت درخت پر سے دو طوطے اندھیرے میں ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے نکلے اور ایک طرف کو غائب ہو گئے۔ لالہ سمجھا کہ یہ درخت پر طوطوں کے لڑنے کی وجہ سے شاخیں ہل رہی تھیں اور اطمینان محسوس کر کے دوبارہ کتاب میں نظریں گاڑ لیں۔

لڑکوں نے جب دیکھا کہ لالہ کتاب پڑھنے میں بری طرح کھو چکا ہے اور کتّا بھی خرگوش کے تعاقب میں کہیں دور نکل گیا ہے تو انہوں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھلوں کو بری طرح کھسوٹنا شروع کر دیا۔ درختوں کے نیچے امرودوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا اور تمام شاخیں پھلوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر اوپر کو اٹھ گئی تھیں۔ امجد نے اس وقت تک کوئی دو ہزار سے زیادہ امرودوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ایک امرود کو دانت سے کاٹتے ہوئے اس نے سامنے والے درخت پر بیٹھے ہوئے احمد کو آہستہ سے آواز دی۔

”کیوں رے احمد۔ کیا سو رہا ہے۔“

احمد نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔

”ہاں یار اب تو توڑنے کو کوئی پھل ہی نہیں رہے۔ سارا صفایا ہو گیا۔“

تین چار درخت کو چھوڑ کر آگے تمام امرود کے درختوں پر پھلوں کو بری طرح نوچ کھسوٹ رہے تھے اور گھبراہٹ کے مارے انہوں نے شاخوں پر اسی طرح ہاتھ مارنا شروع کر دیا کہ ڈالوں کی لچک کی آواز اُڑا اُڑا کر لالہ

کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔

اس نے کتاب کو ایک طرف بند کر کے رکھ دیا اور لالٹین کو ہاتھ میں لے کر اٹھا اور چارپائی کے نیچے سے اس نے ایک خوب مضبوط ڈنڈا نکالا اور اس طرف کو بڑھا جدھر درخت اس طرح ہل رہے تھے جیسے زلزلہ پھٹ پڑا ہو، طوفان آ گیا ہو یا درخت اپنی جگہ سے اکھڑ رہے ہوں۔

امجد نے جب دیکھا کہ لالہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف رُخ کر رہا ہے تو وہ بلّی کی طرح تیزی سے کود کر درخت سے نیچے آ گیا اور سیٹی کی آواز سے پورا باغ گونج اٹھا۔ درختوں کی ڈالیاں ہلنی بند ہو گئیں اور لڑکوں کے دھبا دھب درخت سے کودنے اور بھاگنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لالہ کے ہاتھوں میں لالٹین تھی۔ اس نے جب بھاگنے کی کوشش کی تو لالٹین جھپاکے سے بجھ گئی اور تاریکی اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ اب لالہ کو کچھ بھی نہ سوجھتا تھا۔ اس نے آنکھوں کو بہت بہت پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا اور اس

وقت کتّا بھی کہیں خرگوش کے چکر میں غائب ہو چکا تھا اور اب اس کے لیے لڑکوں کا پیچھا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ان کے قدموں کی آواز پر کان لگا کر چلنے لگا اور چلتا رہا۔

اس وقت سارے لڑکے باغ کی چار دیواری تک پہنچ چکے تھے اور امجد انہیں اپنے کاندھے پر چڑھا چڑھا کر چار دیواری کے پار نرم نرم گھاس پر پھینک رہا تھا جب وہ دو درجن سے زیادہ لڑکوں کو پھینک چکا تو اس کے شانے بری طرح دکھنے لگے اور لالہ کے قریب آئے بڑے قدموں کی آواز سُن کر اس نے کئی دفعہ دیوار پھاندنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ لالہ کے قدم اور بھی زیادہ قریب سنائی دینے لگے تھے اور وہ زیادہ کوشش سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن چونکہ وہاں سہارا دینے والا کوئی نہ تھا اس سے اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی اور آخر جب لالہ کوئی دس قدم رہ گیا تو وہ جلدی سے ایک درخت کی آڑ لے کر چھپ گیا۔ یہ درخت بالکل اندھیرے میں تھا اور اس کے چاروں طرف

جھاڑیاں تھیں۔ وہیں ایک جھاڑی کے اندر چھپ کر امجد نے سانس لیا اور دل ہی دل میں خدا سے جان کی دعائیں مانگنے لگا۔ لالہ اسی طرح لاٹھی کو ہاتھ میں پکڑے چلا آ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے امرودوں کے نقصان پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ آخر کار لالہ بالکل چار دیواری پر پہنچ چکا تھا اور اس نے وہاں سے جب کسی کو نہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ لڑکے چار دیواری کو پھاند کر نکل چکے ہیں اور اب تک ضرور اپنے گھروں کو جا چکے ہوں گے۔ اس نے ان لڑکوں میں سے کسی کو دیکھا بھی نہ تھا اور اس لیے ان کی ہیڈ ماسٹر سے شکایت بھی کرتا تو کیا کرتا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چار دیواری کے باہر سے آواز آئی۔ ''امجد بھیّا !۔۔۔ ارے او امجد بھیّا! آ بھی جاؤ۔''

لالے کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ امجد بھیّا ہی اس کام کی جرنیلی فرما رہے تھے۔ اور ان کی فوج اب غالباً انہیں پکار رہی ہے۔ لالے نے جھٹ ایک ترکیب سوچی اور فوراً چار دیواری کے پاس پہنچا اور پکار کر

بولا۔

”امجد بھیّا کی میں ڈنڈوں سے خاطر کر رہا ہوں یہاں۔“

اور اس نے ڈنڈے کو چار دیواری پر زور زور سے پٹخ پٹخ کر کہا۔ باہر لڑکوں میں بے چینی پھیلتی جا رہی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ اگر امجد واقعی خطرے میں پھنس گیا ہے تو اس کی ضرور مدد کرنی چاہئے ورنہ دوستی کا حق ادا نہ ہو گا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ وہ خطرے میں ہوتا تو سیٹی ضرور بجاتا کیوں کہ اس نے خطرے کا اعلان سیٹی ہی کے ذریعے کرنے کو کہا تھا اور اس کے علاوہ اس نے ایک چمکتا ہوا چھرا ابھی تو دکھایا تھا جو اس نے ان کے سامنے ہی پاجامے کے نیفے میں چھپالیا تھا۔ اس پر انہیں کچھ اطمینان ہوا۔ لڑکوں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ لالے کو امجد کا نام ضرور معلوم ہو گیا ہے اور اگر وہ باغ میں سے کہیں چھپ کر نکل بھی آیا تو اس کی شکایت ضرور ہو جائے گی۔ لالہ ایک ایک درخت کو بڑے غور سے امجد کی تلاش میں دیکھتا رہا۔ لیکن امجد کا کہیں پتا نہ چلا تو اس نے بھی تھک ہار کر سوچا کہ

کم بخت نکل گیا ہو گا اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر لالٹین کو جلانے کی کوشش کرنے لگا۔

امجد رینگتا ہوا چار دیواری تک آیا اور اس دفعہ اس نے اتنے زور کی جست لگائی کہ دوسرے ہی لمحے چار دیواری کے پار چلا گیا۔ وہاں اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکے ابھی تک اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر امجد کو دیکھ کو خوشی سے پھولے نہ سمائے اور انہوں نے اسے کاندھوں پر اٹھا لیا اور بڑی دیر تک اسے اپنے لیڈر کی طرح اٹھائے پھرے۔

آخر امجد نے سبھوں کی محنت کی تعریف کی اور سبھوں کو شاباش دی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے احمد کو کان سے پکڑ کر کہا۔

"ابے احمق! تو نے میرا نام لے کر کیوں پکارا تھا؟ لالہ اب میری شکایت ضرور کرے گا۔"

اس پر سارے لڑکوں نے احمد کو بہت برا بھلا کہا اور آپس میں صلاح بنائی کہ اس وقت چل کر نوٹنکی کے تماشے میں چار آنے کی ٹکٹ خرید کر بیٹھ

رہیں اور گھر جا کر ٹکٹ دکھا دیں کہ ہم تو نوٹنکی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

سارے لڑکے نوٹنکی کے تماشے میں چلے گئے اور ٹکٹ خرید کر اندر جا بیٹھے۔ انہیں چار آنے والی ٹکٹ دس پیسے میں مل گئی تھی کیونکہ تقریباً کھیل ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد جب کھیل ختم ہو گیا تو سارے لڑکے اپنے اپنے گھر کی طرف ہنستے گاتے چلے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب

امجد جب رات گئے گھر پہنچا تو گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس نے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی بھابھی جو اس وقت سو رہی تھی، اُٹھ کر آئی اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے امجد پر برسنا شروع کر دیا۔

”یہ رات کے دس بجے گھر آنے کا وقت ہے؟“ بھابھی نے کڑک کر پوچھا۔

امجد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”بھابھی! اسکول کے ساتھیوں نے چھٹی کے بعد نوٹنکی جانے کا پروگرام بنالیا تھا، سو ان کے ساتھ نوٹنکی دیکھنے چلا گیا تھا۔“

بھابھی کو امجد کی بات پر یقین نہ آیا اور اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”جھوٹا کہیں کا، نوٹنکی گیا تھا۔ ہم کو بے وقوف بناتا ہے۔ اگر اب سے دس بجے آیا تو گھر گھسنے نہ دوں گی۔ سن لے کان کھول کر۔“

امجد نے کہا۔ ”بھابھی میں سچ کہتا ہوں نوٹنکی گیا تھا۔ یقین نہ ہو تو یہ ٹکٹ دیکھ لو۔“

امجد نے جیب سے نوٹنکی والا چار آنے کا ٹکٹ دکھایا۔ اس پر بھابھی کا غصّہ کچھ کم ہوا اور بولی۔

”جب نوٹنکی جانا ہو تو پوچھ کر جایا کر۔ یہاں ہمیں کیا معلوم کہاں گیا تھا۔“

یہ کہتی ہوئی بھابھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور امجد بستے کو طاق میں رکھ کر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس وقت اس کے کندھے بری طرح دکھ رہے تھے اور ابھی سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ بھابھی کی آواز آئی۔

”کیوں رے۔ کھانا تو کھالے۔ وہاں طاق پر رکھ دیا ہے۔“

امجد کا پیٹ تو امرودوں سے بھرا ہوا تھا، اس نے جواب دیا۔ ”نہیں بھابھی صبح کھالوں گا، اس وقت بھوک نہیں لگی۔“

مگر بھابھی کب ماننے والی تھی۔ اسے تو یہ خیال تھا کہ صبح کا کھایا ہوا گھر سے اسکول گیا ہے، یقیناً بھوکا ہوگا اور اسی لئے وہ کھانا لے کر امجد کے پاس آئی اور اپنے ہاتھوں سے توڑ توڑ کر نوالہ اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔

”ببّو نے کھانا کھالیا بھابھی۔“

امجد نے پوچھا۔ ببّو امجد کا چھوٹا بھتیجا تھا۔

”اور کیا تیرے انتظار میں دس بجے تک جاگتا رہتا۔ وہ تو ابّا کے ساتھ کھا کر سو گیا ہے۔“ بھابھی بولی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد امجد اپنے کھاٹ پر جا لیٹا اور دن بھر کے واقعے کو سوچتا سوچتا سو گیا۔ صبح سویرے امجد کے بھیّا جب مسجد سے نماز پڑھ کر گھر لوٹے اور ابھی دفتر جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ باہر سے لالہ کاشی

رام کے پکارنے کی آواز آئی۔ امجد کے بھیّا باہر نکل کر آئے اور انہوں نے لالہ جی کو کمرے میں بلا کر بٹھایا۔ لالہ کے پاس کچے امرودوں کی ایک بھری ہوئی ٹوکری بھی تھی۔ ٹوکری کو امجد کے بھیّا کے سامنے رکھتے ہوئے لالہ غصے سے بولا۔

"یہ دیکھ لو اپنے چھوٹے بھائی کی کرتوت۔ رات کو سارے درختوں کو پھلوں سے جھاڑ کر رکھ دیا۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میں یہ نقصان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ یا تو مجھے امرودوں کی قیمت چکا دو ورنہ میں تھانے جا کر رپورٹ کراؤں گا۔"

یہ سنتے ہی امجد کے بھیّا کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے امجد کے رات کو دیر سے آنے کا مطلب سمجھ لیا۔ انہوں نے لالہ کو تو باہر بیٹھے رہنے دیا اور خود اندر آ کر امجد کی بھابھی کو پکارا۔

"سنتی ہو۔ تمہارے دیور نے رات کو کیا ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔ بے چارے لالہ جی کے امرود کے باغ کو ننگا کر آیا۔ کہاں ہے امجد بلاؤ میں ابھی اس کی

خبر لیتا ہوں۔"

امجد کی بھابھی کے اس وقت سر میں بری طرح درد تھا۔ وہ وہیں سے لیٹی لیٹی بولی۔ "کون کہتا ہے کہ امجد نے لالے کا باغ تباہ کیا۔ وہ تو اسکول کی چھٹی کے بعد لڑکوں کے ساتھ نوٹنکی کا تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ یہ ہے نوٹنکی کا ٹکٹ۔ یہ لالہ کو دکھا دو اور کہہ دو کہ دوسرے کے کہنے میں آکر خواہ مخواہ کسی کا الزام کسی کے سر پر نہ تھوپا کرے۔"

یہ کہتی ہوئی بھابھی نے نوٹنکی کا ٹکٹ آنچل سے کھولا اور امجد کے بھیّا کے حوالے کر دیا۔ ٹکٹ پر صاف رات کی تاریخ تھی اور چھ بجے سے رات دس بجے کا وقت لکھا ہوا تھا۔ امجد کے بھیّا کا سارا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ ٹکٹ کو ہاتھوں میں لئے ہوئے باہر آئے اور لالہ سے بولے۔

"لالہ جی۔ آپ کو کسی نے غلط بتایا کہ امجد نے آپ کے امرود توڑے ہیں۔ امجد تو رات نوٹنکی کا تماشہ دیکھنے گیا تھا۔ یہ دیکھ لیجئے نوٹنکی کا ٹکٹ بھی ہے۔"

لالہ نے نوٹنکی کا ٹکٹ خوب غور سے دیکھا اور سمجھ گیا کہ ضرور یہ لڑکوں کی شرارت تھی کہ امجد کا نام لے کر اسے بدنام کرنا چاہتے تھے۔ اور جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ دوسرے لڑکوں کو کوستا ہوا ٹوکری اٹھا کر جانے لگا اور چلتے چلتے کہنے لگا۔

"مجھے امجد سے ایسی امید بھی نہ تھی۔ وہ تو بڑا اچھا لڑکا ہے۔ چار دیواری کے باہر سے لڑکوں نے امجد کا نام لے کر اس لئے پکارا ہو گا کہ امجد بدنام ہو۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ دوسرے لڑکوں کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ خیر اگر امجد کا جی چاہے تو اس سے کہہ دیجئے گا کہ کبھی کبھار باغ میں آ کر امرود کھا لیا کرے۔"

یہ کہہ کر لالہ چلا گیا اور امجد کے بھیّا دروازہ بند کر کے ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ امجد کی نیند بھی کھل چکی تھی اور وہ بستر پر چپ چاپ لیٹا ہوا ساری باتیں سن رہا تھا اور آپ ہی آپ لالہ کا منہ چڑا رہا تھا کہ دیکھو اب لالہ سیدھے راستے پر آیا ہے۔ کہتا ہے جب جی چاہے آ کر امجد امرود کھا لیا

کرے۔ اب ہوش آیا ہے لالہ جی کو۔ امجد نے لحاف میں منہ چھپا کر خوب زور سے ہنسنا شروع کر دیا اور خوب خوش ہوا کہ لالہ کو کیا خوب بے وقوف بنایا ہے۔

اس وقت امجد کے بھیّا دفتر کی تیّاری کر رہے تھے۔ ناشتہ ختم ہو چکا تھا اور بھابھی اس طرف بیمار لیٹی ہوئی تھی۔ امجد انتظار میں تھا کہ بھیّا ادھر دفتر کے لئے روانہ ہوں تو وہ اچھل کر بستر سے اٹھ کھڑا ہو۔ بھیّا کے سامنے تو اس کی دال نہ گلتی تھی اور وہ ان سے بے حد ڈرتا بھی تھا کیوں کہ بھیّا اگر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تو اس کی جان نکلنے لگتی تھی۔ اس لئے جب بھیّا گھر میں موجود ہوتے تو وہ بھیگی بلّی بنا چپ چاپ بیٹھا رہتا اور ان کے جاتے ہی وہ کُدکڑے لگاتا کہ گھر تو گھر محلے والے بھی پناہ مانگنے لگتے تھے۔ جب بھیّا دفتر جانے لگے تو بھابھی سے بولے۔

”ڈاکٹر تو یہاں آتا نہیں۔ کیا کروں شام کو دفتر سے واپسی پر تمہاری دوا لیتا آؤں گا۔ امجد تو کسی کام کا ہے نہیں۔ اسے تو کھیلنے کودنے ہی سے فرصت

نہیں۔ یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی بیمار ہے یا مر رہا ہے۔ تم اس کے لئے جان چھڑکتی ہو۔ خیر۔"

بھیّا ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے چھاتا بغل میں دبائے ایک ہاتھ میں فائل لئے ہوئے دفتر کو چلے گئے۔ امجد دھم سے چارپائی سے کود کر نیچے آیا اور بھابھی کے گلے سے جا کر لٹک گیا۔ بھابھی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہٹ رے۔ میری جان میں مت لٹک۔ میری خود طبیعت خراب ہے۔ جا ادھر بیٹھ۔"

امجد نے اسی طرح لٹکے ہوئے کہا۔ "بھابھی تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بُلا لاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں آتا۔ نہیں آئے گا تو میں۔۔۔"

بھابھی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں تو مت جا۔ بھیّا خود ہی شام کو دوا لے آئیں گے۔ تو جائے گا تو ضرور کوئی نہ کوئی فساد کھڑا کر آئے گا۔"

امجد فوراً اچھل کر دروازے سے نکل بھاگا۔ بھابھی اسے منع ہی کرتی رہی

کہ مت جامت جا۔ مگر امجد کہاں ماننے والا تھا۔ وہ تو فوراً بھاگا ہوا ڈاکٹر کے دواخانے میں پہنچا۔ ڈاکٹر اس وقت دوا بنا بنا کر سب کو دے رہا تھا اور نقد پیسے وصول کر رہا تھا۔ ان میں بعض ایسے مریض بھی تھے جن کے پاس دوا کے لئے دام بھی نہ تھے اور جنہیں ڈاکٹر گالیاں دے رہا تھا اور دھکے مار مار کر دواخانے سے نیچے اتار رہا تھا۔ امجد سیدھا ڈاکٹر کی میز کے پاس پہنچا اور میز پر مکے مارتا ہوا بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!“

”کیا ہے بے؟ میز کیوں توڑے ڈال رہا ہے کم بخت؟ کچھ مُنہ سے بھی پھوٹے گا۔“ ڈاکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔

”میری بھابھی بیمار ہے۔ تم نے کیسی دوا دی تھی کہ وہ اچھی نہیں ہوئی۔“ امجد بولا۔

”چل دفع ہو یہاں سے مردود۔ کہتا ہے کیسی دوا دی تھی۔ میں نے کوئی تیری بھابھی کی بیماری کا ٹھیکہ لیا ہے کہ اچھی ہی ہو جائے گی۔ نہیں اچھی ہوتی تو نہ ہو۔ میں کیا کروں۔“ ڈاکٹر بولا۔

امجد غصّے میں آ گیا اور فوراً دوا کی بھری ہوئی ایک بوتل کو چھنّاک سے میز پر دے ماری اور اکڑ کر بولا۔ ”کیا کہتا ہے؟ میں تیری ایک ایک شیشی پھوڑ ڈالوں گا۔ حرام کے پیسے دیئے تھے جو تو نے رنگ گھول کر پانی کی شیشی میں دی تھی۔“ ڈاکٹر ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ امجد کی شرارت پورے گاؤں میں مشہور ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کر گزرے۔ اس کی شرارتوں سے پورا محلہ ڈرتا تھا اور آئے دن کسی نہ کسی کی شامت آئی رہتی تھی اور لوگ اس سے پناہ مانگتے رہتے تھے۔ ابھی وہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ امجد نے پھر میز پر مکّہ مار کر کہا۔

”کان کھول کر سُن لو ڈاکٹر صاحب! اگر آج شام تک بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو تمہاری خیر نہیں۔ میرا نام امجد ہے اور میں محلّے کے سارے لڑکوں کا سردار ہوں۔ رات کی رات تمہارے کھیرے کی بیلوں کو اُکھاڑ کر پھنکوا دوں گا، جو جی میں آئے کر لینا۔ شام تک کی مہلت دیتا ہوں، سوچ لو۔“

امجد یہ دھمکی دے کر یہ جا وہ جا۔ ڈاکٹر دوا وغیرہ چھوڑ فوراً سوچنے لگا کہ آج رات کھیرے کی بیلوں کی تو خیر نہیں۔ آس پاس بیٹھے ہوئے غریب مریض جو ڈاکٹر سے جلے بیٹھے تھے آپس میں کہنے لگے کہ اس لڑکے سے کوئی عجب نہیں۔ رات آدھے گھنٹے میں لالے کا دو بیگھا باغ کے کچّے پکّے سارے امرودوں کو جھاڑ ڈالا تھا۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ ڈاکٹر کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور اس نے سارے مریضوں کو دوا دینی شروع کر دی اور کسی کو تو ادھار بھی دے دی۔

جب وہ دوا بانٹ چکا تو مریضوں سے بولا۔ "بھائی تم لوگ گواہی دینا کہ یہ لڑکا مجھے دھمکی دے گیا ہے۔ میں ابھی پولیس کو رپورٹ کرتا ہوں۔"

مریضوں نے ڈاکٹر سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ تو ہم سے نہ ہو گا۔ ہم کیوں اپنے گھر میں مصیبت مول لیں۔ ہم گواہی نہیں دے سکتے۔"

ڈاکٹر کو غصّہ آ گیا اور بولا۔ "عجیب ذلیل آدمی ہو تم لوگ۔ مُفت کی دوا بھی

لے جاتے ہو۔ اتنا ذرا سا کام کرنے میں بھی مرے جاتے ہو۔"

مریضوں نے کہا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب! ہم تو اس لالچ میں نہیں آئیں گے۔ یہ لڑکا سدا کا مُنہ چڑھا ہے۔ وہ ہمارا گاؤں میں رہنا دوبھر کر دے گا۔ اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً اُس کی بھابھی کو جا کر دیکھ لو اور اچھی دوا دینا تا کہ شام تک آرام آ جائے ورنہ رات بھر میں تمہارے کھیرے کی بیلیں اُکھڑی پڑی ہوں گی۔"

مریض یہ کہہ کر اپنی اپنی دوا اٹھا کر چلتے بنے اور ڈاکٹر پریشانی میں میز کے پاس تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کِیا جائے۔ آخر جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا تو اس نے دواخانہ بند کر کے دوا کا بیگ اور چھتری ہاتھ میں لے کر امجد کے گھر کی طرف کا رخ کیا۔۔۔

دواخانے سے واپس آ کر امجد ببّو کے ساتھ بیٹھا پنجرہ بنانے لگا۔ ببّو اسے پنجرہ بنانے میں ساتھ مدد کر رہا تھا۔ ببّو اسے کماچیاں دیتا جاتا تھا اور ایک ہاتھ سے پنجرے کو بھی پکڑے تھا اور امجد پنجرہ بُنتا جا رہا تھا۔ امجد ببّو سے

بولا۔ ”ببّو پنجرے کو ٹھیک سے پکڑے رہنا۔ ہے نا۔“

ببّو نے پنجرے کو پکڑے پکڑے جواب دیا۔ ”ہاں، امجد بھیّا۔ اگر زوروں سے نہیں پکڑا تو چڑیا پھُر سے اُڑ جائے گی نا؟“

”ہاں۔ تُو تو بڑا سمجھ دار بچہ ہے۔“ امجد بولا۔

اتنے میں ڈاکٹر چھتری بغل میں دبائے اور ناک پر چشمہ ٹھیک کرتا ہوا سامنے سے آتا دکھائی دیا اور امجد یا ببّو کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔ بھابھی اُس کمرے کے اندر چارپائی پر لیٹی ہوئی درد سے تڑپ رہی تھی اور بخار میں بھُن رہی تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اُس نے چارپائی کے اوپر اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے تکلیف کے مارے اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے لیٹے رہنے کو کہا اور بولا۔ ”بیٹا! کب سے بیمار ہو؟ کسی سے کہلوا ہی بھیجتیں۔ میں خود آ جاتا۔ امجد سے آج معلوم ہوا کہ تم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئیں۔ ملیریا بخار ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ لو دوا ساتھ لیتا آیا ہوں۔ اسے کھالو۔ شام تک بالکل آرام آجائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے فوراً بیگ کھولا اور اس میں سے دوا کی ایک شیشی نکال کر دی اور خود ہی پلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بہت اچھی دوا ہے۔ فوراً آرام آ جاتا ہے۔ شام تک بخار نہیں رہے گا۔ اگر اس کے بعد بھی تکلیف باقی رہے تو میں خود شام کو آ جاؤں گا اور دیکھ لوں گا تم فکر نہ کرنا۔“

بھابھی بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ آپ نے آ کر مجھے دیکھا۔ اس کے لئے آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔“

”کوئی بات نہیں بیٹی۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں تو تمہاری خدمت کے لئے ہی ہوں۔ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے، تم اچھی ہو جاؤ، یہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔“

بھابھی نے امجد کو پکار کر کہا کہ صندوقچی کو کھول کر ڈاکٹر صاحب کی فیس کے دو روپے دے دے۔ جب امجد نے روپے نکال کر ڈاکٹر صاحب کو دیے تو انہوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! یہ فیس کیسی؟ تم تو میری بیٹی کے برابر ہو۔ اپنی بیٹی سے بھی کوئی فیس لیتا ہے؟“ اور یہ کہہ

کر اس نے بیگ اور چھتری اُٹھالی اور چلنے لگا۔

امجد جب باہر چلا گیا تو ڈاکٹر بھابھی سے آہستہ سے بولا۔ ”بیٹی ذرا امجد کو منع کر دینا کہ میری کھیرے کی بیلوں کو نہ اکھاڑے۔“

بھابھی مُسکرا دی اور بولی۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب امجد آج کل بڑا شریر ہو گیا ہے۔ میں اسے ضرور منع کر دوں گی آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔“

ڈاکٹر شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر صحن میں امجد، ببّو کے ساتھ بیٹھا اسی طرح چپ چاپ پنجرہ بُننے میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا ”ہونہہ“ کر کے آگے بڑھ گیا۔ ببّو اُٹھا اور اسی کی طرح کمر کو جھکا کے چلتا ہوا بولا۔ ”ہونہہ“۔ اس طرح نقل اتارنے پر دونوں خوب ہنسے۔ اتنے میں اندر کمرے سے آواز آئی۔ ”ارے امجد!“

امجد پنجرے کو چھوڑ بھاگا ہوا اندر کمرے میں گیا۔

”کیا بات ہے بھابھی!“ امجد بھابھی کے گلے میں لٹکتے ہوئے بولا۔

”ارے امجد! تو اتنا کیوں شریر ہو گیا ہے رے۔ تو نے ڈاکٹر کو جا کر کیا کہا تھا؟“

امجد ہنس پڑا اور سارا قصّہ سنا دیا۔ بھابھی ہنسی کو دانتوں سے دباتی ہوئی بولی۔
”نہیں۔ میرا راجہ بھیّا! اس طرح کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ تُو تو اب اچھا سمجھ دار لڑکا ہو گیا ہے۔ تیرے بھیّا بے چارے تیری شرارتوں ہی کی وجہ سے تو پریشان رہتے ہیں۔ لکھے پڑھے گا نہیں تو بڑا ہو کر کس طرح سنبھالے گا۔“

امجد بولا۔ ”میں کیا گھر سنبھالوں گا۔ تم تو سنبھال ہی رہی ہو۔ تم نہ ہوتیں تو مجھے ایسی اچھی اچھی چیزیں پکا کر کون کھلاتا؟“

”تجھے تو جیسے میری بڑی قدر ہے نا؟ تیری وجہ سے ایک پل بھی چین نہیں پڑتا۔ جب دیکھو ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ میں کہتی ہوں اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ شرارتیں کرنا بند کر دے اور خوب جی لگا کر پڑھ۔“

امجد روٹھتا ہوا بولا۔ ”نہیں بھابھی میرا پڑھائی میں جی نہیں لگتا۔“

بھابھی اسے غصّے سے گھورتی ہوئی بولی۔ ”کیا کہا۔ جی نہیں لگتا۔ جا پھر میں تجھ سے نہیں بولوں گی۔“

”کیوں نہیں بولو گی؟“

”میں یہاں سے ایک دن جا کر دریا میں ڈوب جاؤں گی۔“ بھابھی بولی۔

”واہ بڑی آئیں دریا میں ڈوبنے والی اور ببّو کو کون دیکھے گا۔“ امجد بولا۔

”ببّو اپنے باپ کے پاس رہے گا۔“ بھابھی بولی۔

”نہیں بھابھی ایسی باتیں مت کیا کرو۔“ امجد کی آنکھ میں آنسو بھر آئے۔

”تُو پھر شرارتیں تو نہیں کرے گا۔“ بھابھی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔

”نہیں کروں گا۔“ امجد منہ بنا کر بولا۔

”شاباش، میرا راجہ بھیّا کتنا اچھا ہے میں اس کے لئے چاند سی دلہن لاؤں گی۔“

”نہیں چاہئے دلہن ولہن۔“ امجد رونی آواز میں بولا۔

”ارے تو کیا یوں ہی بیٹھا رہے گا۔“

”ہاں تم تو ہو ہی میری اچھی بھابھی۔ مجھے کیا چاہئے۔“

ببّو نے اتنے میں باہر سے آواز دی۔ ”ارے امجد بھیّا۔ پنجرہ تیّار ہو گیا۔ چڑیا پکڑنے نہیں چلو گے۔“

اور امجد کمرے سے بھاگا ہوا باہر نکل گیا اور ببّو کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”چڑیا تو بعد میں پکڑیں گے۔ مُنّی اور! چھُنّی کی تو خبر لے آئیں تالاب جا کر۔“

”مُنّی اور! چھُنّی امجد کی دو مچھلیوں کا نام تھا جو اس نے پال رکھی تھیں اور مکان کے پچھواڑے چھوٹے سے تالاب میں تیرتی رہتی تھیں۔ اُن کا

رنگ سُرخ تھا اور جب ساتھ ساتھ پانی میں تیرتی ہوئی چلتی تھیں تو دونوں
آپس میں سگی بہنوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ سارے گاؤں والوں کو
امجد کی پالتو مچھلیوں کے بارے میں معلوم تھا اور کوئی انہیں جال سے نہیں
پکڑتا تھا بلکہ گاؤں کے لڑکے بڑی دیر دیر تک چنے اور دوسری چیزیں لاکر
مُنّی اور !چھُنّی کو کھلاتے اور ان کا تماشا دیکھتے رہتے تھے۔ امجد کو تو یہ
مچھلیاں بہت زیادہ پیاری تھیں اور وہ دن میں تین تین چار چار دفعہ جاکر
انہیں نہ دیکھتا تو اسے چین نہ پڑتا۔ مچھلیاں بھی اس کے قدموں کی چاپ
سن کر پہچان لیتی تھیں اور جہاں وہ تالاب کے کنارے پہنچتا مچھلیاں بھاگتی
اور اچھلتی ہوئی اس کے پاس آجاتیں اور دونوں سر کو جھکا کر اس طرح اس
کے سامنے تیرنے لگتیں جیسے امجد کو سلام کر رہی ہیں، امجد انہیں خوب
پیار کرتا اور ان سے بڑی دیر تک کھیلتا رہتا۔ وہ ان دونوں مچھلیوں کو بہت
چھوٹے پن سے لے کر اب تک پرورش کرتا آرہا تھا اور اس لیے اسے ان
غریب جانوروں سے اتنی محبت تھی جتنی سگے بھائی بہنوں سے ہوتی ہے۔

یہ مچھلیاں بھی اب بہت جوان ہو گئی تھیں۔ مُنّی اور !چھُنّی بھی چھوٹے تالاب کی دنیا میں آزادی سے زندہ تھیں کیونکہ وہاں انہیں اپنی جان کا خطرہ نہ تھا کہ کوئی مچھیرا انہیں جال میں پھنسا کر لے جائے گا۔ وہ بھی تالاب کو اپنی آزاد دنیا کی طرح سمجھتی تھیں اور اس میں خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔

امجد اور ببّو تالاب میں بڑی دیر تک مُنّی اور !چھُنّی کے ساتھ کھیلتے رہے اور ان کو دانے کھلاتے رہے۔ مچھلیاں کللیں کرتی پھر رہی تھیں۔ اور ببّو انہیں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور پانی میں ہاتھ ڈال کر چھینٹے اُڑا رہا تھا۔ جب ان کا دل مچھلیوں سے کھیل کر بھر گیا تو انہوں نے پانی میں اتر کر نہانا شروع کر دیا اور ایک دوسرے پر پانی اچھالنے لگے۔ اتنے میں پیچھے سے نوکرانی نے آواز دی۔ ”ببّو اور امجد۔ چلو کھانا کھالو۔“

آخر دونوں بچے تالاب سے نکلے اور کپڑے پہن کر گھر کی طرف چلنے لگے۔ راستے میں بھی وہ شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ قریب ہی راستے میں

اندھی بڑھیا کی جھونپڑی ملی تو انہوں نے ایک دو کھیرے توڑ لیے اور وہاں سے بھاگتے ہوئے گھر پہنچے۔ بڑھیا اس وقت خرّاٹے لے لے کر سو رہی تھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ لڑکے کب آئے اور کب دروازے پر لٹکے ہوئے دونوں کھیرے جسے آج کھانے کا پروگرام تھا، ٹوٹ چکے ہیں۔ امجد دل ہی دل میں بولا۔ ''ماسٹر صاحب ٹھیک کہتے تھے کہ 'جو سویا سو کھویا۔ جو جاگا سو پایا'۔''

نیالڑکا

لڑکے اپنی جماعت میں ماسٹر صاحب کے آنے کے انتظار میں اپنی اپنی کاپیاں کھول کر بیٹھے تھے۔ بعض کل کا سبق دہرا رہے تھے۔ بعض نئے سبق کی تیاریاں کر رہے تھے۔

امجد بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور لڑکوں کو بعض سوالات کے جواب حل کر کے دے رہا تھا۔ اس معاملے میں امجد بہت ہوشیار تھا۔ شرارت کے وقت شرارت اور پڑھائی کے وقت پڑھائی، اس اصول کا قائل تھا۔

اسے ہمیشہ سبق زبانی یاد ہوتا تھا اور ماسٹر صاحب کے ہر سوال کا جواب دینے کے لئے پہلے ہی ہاتھ کھڑا کر دیتا اور ہر سوال کا صحیح جواب دیتا۔

ماسٹر صاحب بھی امجد سے بہت زیادہ خوش تھے اور اس لئے کلاس میں امجد کو ماسٹر نے کبھی چھوا تک نہیں اور بلکہ ہمیشہ اس کی تعریفیں کیں۔ اسی لئے اُس کی شرارتوں پر بھی کبھی اسے معاف کر دیا جاتا تھا۔

امجد نے اپنی جماعت میں خوب سِکّہ بٹھا دیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک محنتی طالب علم تھا اور دل لگا کر اپنا سبق یاد کیا کرتا تھا۔ امتحان میں سب سے زیادہ نمبر اُسی کے آتے تھے اور وہ ہمیشہ اوّل رہتا تھا۔ کئی دفعہ تو اُسے انعامات بھی مل چکے تھے۔ اس وقت بھی امجد اپنے ساتھیوں کو سبق یاد کرانے میں مصروف تھا، اتنے میں جماعت میں یکایک سنّاٹا چھا گیا اور ماسٹر صاحب ایک لڑکے کو ساتھ لئے اندر داخل ہوئے۔ نئے لڑکے کو انہوں نے اپنی کرسی بٹھا دیا اور خود حاضری لے کر جماعت سے باہر چلے گئے۔

لڑکا خوب بنا ٹھنا بیٹھا تھا۔ اس کے بال بہت اچھّے بنے ہوئے تھے۔ آنکھ

میں کاجل لگا ہوا تھا اور سِلک کی قمیص پر ایک کوٹ پہن رکھا تھا۔ نیچے بھی سِلک ہی کی پتلون تھی۔ کوٹ کے کالر میں ایک گلاب کا بڑا سا پھول بھی لگا ہوا تھا۔ گلے میں ریشمی مفلر لپٹا ہوا تھا۔ چہرے پر پاؤڈر لگا ہوا تھا اور ایک چمڑے کا خوبصورت سا چمک دار تھیلا ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جس میں شاید کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ لڑکا چُپ چاپ بیٹھا ہوا مٹر مٹر لڑکوں کو تکے جا رہا تھا۔

امجد نے احمد کو آواز دے کر کہا۔ ”ارے بھئی احمد! بس سہرے کی کسر رہ گئی ورنہ پورے دولہا بابو معلوم ہوتے ہیں۔“

لڑکے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ پیچھے سے ایک لڑکے نے آواز دی۔ ”معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے نہیں آئے بلکہ دعوت میں تشریف لائے ہیں۔“

ایک قہقہہ بُلند ہوا۔ پھر ایک اور آواز پیچھے کی بنچ سے گونجی۔ ”کرسی پر اکڑ کر کیسے بیٹھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تصویر کھنچوا رہا ہے۔“

اس پر لڑکے نے گھبرا کر جلدی جلدی آنکھیں جھپکانی شروع کر دیں اور بے چارہ گھبرا سا گیا۔ پسینے کے قطرے اُس کی پیشانی پر جمع ہونے لگے۔ اس پر امجد فوراً بولا۔ ”لو بھئی، اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ سارا پاؤڈر دھل کر رہ جائے گا۔“

لڑکا اور زیادہ گھبرایا اور بار بار دروازے کی طرف دیکھنے لگا تاکہ ماسٹر صاحب آئیں اور اسے ان لڑکوں کے ہنسی مذاق سے نجات دلوائیں لیکن مسٹر صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اتنے میں امجد کو شرارت سوجھی۔ وہ ڈیسک سے نیچے کھسک کر زمین پر اُتر گیا اور رینگتا ہوا میز کے نیچے چلا گیا۔ وہاں سے اُس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر نئے لڑکے کے پاؤں کو پکڑ لیا اور بِلّی کے بچّے کی سی آواز منہ سے نکالی۔ ”خوں، خوں، خوں۔“

لڑکا گھبرا کر زور زور سے پاؤں زمین پر پٹخنے لگا۔ اس پر سارے لڑکے تالیاں بجا بجا کر ہنس پڑے۔ امجد ایک طرف کونے میں دبک گیا۔ اتنے میں احمد بھی اسی طرح ڈیسک کی آڑ لے کر نیچے اُترا اور آہستہ آہستہ میز

کے نیچے پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چونے کی بوری کھولی جو دیواروں کی قلعی کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس بوری میں سے اُس نے چونا نکال کر لڑکے کی کرسی کے پیچھے پھیلا دیا اور جب لڑکا جماعت کی طرف دیکھنے میں گُم تھا، آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کرسی پیچھے اُلٹ دی۔ لڑکا چونے میں لت پت ہو گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ سارے لڑکوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں اور چلّانے لگے۔ ”لو بھائی میاں صاحب گر پڑے، میاں صاحب گر پڑے۔“

امجد فوراً بڑھا اور سبھوں کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”بھئی یہ تمہارا نیا ساتھی ہے۔ اسے تنگ کیوں کرتے ہو۔“ اور اس کے کپڑے جھاڑنے لگا اور اس کے آنسو پوچھنے لگا۔

اتنے میں ماسٹر صاحب اندر داخل ہوئے اور انہوں نے گرج کر پوچھا۔ ”کیوں امجد۔ یہ کیا شرارت ہے؟“

امجد نہایت ادب سے بولا۔ ”ماسٹر صاحب۔ یہ بے چارے کرسی سے نیچے

جا گرے تھے۔ میں انہیں اُٹھا کر کپڑے درست کر رہا ہوں۔"

ماسٹر صاحب نے لڑکے کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ اُن کا نیا ساتھی ہے اور اسکول کے سیکرٹری صاحب کا لڑکا ہے۔ تمام لڑکوں کو اس کی عزّت کرنی چاہئے کیونکہ اُنہیں کے والد کے باعث سارا اسکول چل رہا ہے اور لڑکوں کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ اِسے کبھی تنگ نہ کریں ورنہ انہیں اسکول سے نکال دیا جائے گا اور ان کے والدین سے ان کی شکایت بھی کی جائے گی۔ اس لڑکے کے لئے اپنی میز کی دوسری طرف کرسی رکھ دی اور کہا کہ یہ یہیں بیٹھا کریں گے۔ لڑکوں کو ماسٹر صاحب کی یہ بات بہت بری معلوم ہوئی کہ سارے لڑکے تو ایک جگہ بیٹھیں اور یہ بابو صاحب الگ کرسی پر بیٹھے ہوں۔

انہیں پھر یہ بھی خیال آیا کہ شاید یہ اس لئے کہ یہ امیر باپ کا لڑکا ہے اور وہ سب غریب باپ کے بچے ہیں۔ ان کے پاس پہننے کو اچھے اچھے کپڑے نہیں ہیں۔ کتاب رکھنے کو خوب صورت تھیلا نہیں ہے۔ اور ان کی مائیں

انہیں پاؤڈر اور کریم سے سنوار کر نہیں بھیج سکتیں۔ اس خیال سے لڑکوں کو اس نئے لڑکے سے ایک قسم کی نفرت ہو گئی۔ وہ انہیں سامنے بیٹھا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان کی غربت کا مذاق اڑا رہا ہو اور کہہ رہا ہو تم جانور ہو۔ تم کپڑے پہننا کیا جانو اور تمہیں کرسی پر بیٹھنا کب آتا ہے۔

تمام لڑکوں کا دل اس بات پر کُڑھنے لگا۔ وہ جی ہی جی میں اس سے نفرت کرنے لگے۔ امجد بھی اس لڑکے سے جی ہی میں جلنے لگا کہ یہ لڑکا کہیں اس سے زیادہ ماسٹر صاحب کے دل میں جگہ نہ پیدا کر لے اور اس لئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ لڑکے کو اتنا تنگ کیا جائے کہ یہ اسکول آنا ہی چھوڑ دے۔ وہ طرح طرح سے سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ کیا کیا شرارتیں کی جائیں۔ وہ یہی بیٹھا سوچتا رہا اور یہاں تک کہ وہ اس دن کا سبق بھی اچھی طرح نہ سُن سکا۔ ماسٹر صاحب جب کلاس سے باہر نکلے تو تو لڑکے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ لڑکوں کے دل میں اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کی تمنّا دل ہی میں رہ گئی۔

چھٹّی کے بعد سارے لڑکے اسکول کے احاطے سے نکل کر آم کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ امجد بھی وہیں بیٹھا تھا لیکن کچھ خاموش تھا۔ لڑکے آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا۔ ”آیا بڑا نواب زادہ۔ پڑھنے نہیں آیا تھا ہم پر سوٹ بوٹ کا رُعب جمانے آیا تھا۔“

کوئی کہتا۔ ”لونڈیوں کی طرح سنگار کر کے کیسے آیا تھا۔“

احمد بولا۔ ”اور گھمنڈی کتنا ہے۔ بات تک نہیں کرتا۔ جیسے ہم سب اُس کے باپ کے غلام ہیں۔“

امجد نے پوچھا۔ ”اس کا باپ کون ہے؟“

اس پر ایک لڑکے نے بتلایا کہ اس کا باپ دارجیلنگ میں چائے کا ایجنٹ ہے اور دارجیلنگ کی سارے چائے کے باغ کا ٹھیکہ اس کے پاس ہے اور وہ چائے باہر کے ملکوں میں بھیجتا ہے۔ ندی کے کنارے اس نے ایک بہت خوب صورت کوٹھی بنوائی ہے۔ اس کوٹھی کے گرد رنگ برنگے پھول لگوائے ہیں اور کوٹھی کے باہر ہر وقت ایک نیلی موٹر کھڑی رہتی ہے

جس پر صبح سویرے اس کا باپ دار جیلنگ جایا کرتا ہے۔

امجد بولا۔ ”میں سارے چائے کے باغ ہی کو اُکھاڑ ڈالوں گا۔“

اس پر احمد بولا۔ ”یار چائے کا باغ تو میلوں میل لمبا ہے۔ ایک دفعہ میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا تھا تو وہ کہہ رہے تھے کہ چائے کے باغ میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ ہم تم کیا باغ اکھاڑیں گے۔“

امجد کی ہمّت ٹوٹ گئی اور وہ جل کر بولا۔ ”تو ہم اس کی موٹر کے ٹائر میں چھُرا بھونک دیں گے۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح جائے گا چائے کے باغ میں۔“

لڑکوں نے اس ترکیب کی داد دی، لیکن سُنا گیا تھا کہ کوٹھی کے باہر ایک دربان بھی وردی پہن کر بیٹھا رہتا ہے۔

امجد بولا۔ ”ہم رات کے وقت یہ کام کریں گے۔ بہر حال اس وقت تو ایک دوسرا پروگرام ہے۔“

"کون سا پروگرام۔" احمد بولا۔

"بڑھیا کے کھیرے بہت پھل رہے تھے۔ آج انہیں توڑنا ہے۔"

لڑکوں کی فوج بڑھیا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ بڑھیا کا گھر لالہ کے باغ کے ٹھیک پیچھے واقع تھا اور بڑھیا کی بُڈھی بکری چوبیس گھنٹے دہلیز کے اُوپر بیٹھی ہوئی او نگھتی رہتی تھی۔ اس بُڈھی بکری سے ایک بچّہ بھی تھا۔ چھوٹا سا سفید رنگ کا بچہ جس کا چمڑا نہایت ملائم تھا اور اس کے بال چھونے سے ہاتھوں میں گدگدی ہوتی تھی۔ دراصل بُڈھی بکری اس بچّے کی پیدائش کے بعد سے زیادہ بُڈھی نظر آنے لگی لیکن اندھی بُڑھیا کو اس بکری سے بے حد محبّت تھی اور یہی اس کی تنہائی کا سہارا تھی۔ بڑھیا بکری کا دودھ ہی پی کر گزارا کرتی تھی۔ ابھی بچّے بڑھیا کی گلی کے سامنے سے گزر ہی رہے تھے کہ انہیں تین چار بکریاں کھیرے کی بیل کو کھاتی ہوئی نظر آئیں۔ لڑکوں نے فوراً تمام بکریوں کو لات مار مار کر بھگا دیا اور خود کھیروں پر ٹوٹ پڑے۔

بڑھیا نے جب پٹاپٹ کھیرے توڑنے کی آواز سُنی تو فوراً کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ لڑکے چُپ چاپ ایک کونے میں دُبک گئے اور بھاگتی ہوئی بکریوں کی آواز سُن کر بڑھیا اُن کے پیچھے لپکی اور سینہ کوٹتی ہوئی بولی۔

''چل، مُنہ جلی۔ ابھی تجھے کانجی ہاؤس لے چلتی ہوں۔''

بڑھیا نے بکریوں کو پکڑا اور کانجی ہاؤس کی طرف لے کر چلی گئی۔ لڑکوں کے لئے اب کھُلا موقع تھا اور انہوں نے کھیروں کی وہ کھسوٹ مچائی کہ تمام بیلیں کھیروں سے خالی ہو گئیں۔ کھیرے توڑنے کے بعد لڑکے اپنی اپنی راہ لے کر روانہ ہو گئے۔ ابھی امجد کھیرے کھاتا ہوا بڑھیا کی گلی سے ذرا ہی آگے بڑھا تھا کہ اُسے وہی اسکول والا نیا ساتھی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ امجد جلدی سے کھیرے کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کا پورا منہ کھیرے سے بھرا ہوا تھا۔ چھپاتے چھپاتے بھی نئے لڑکے نے اسے کھیرا کھاتے ہوئے دیکھ لیا اور فوراً سمجھ گیا کہ یہ بڑھیا کے کھیرے لوٹ کر آرہا ہے۔ نیا لڑکا امجد کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”غریب بڑھیا کا کھیرا کھاتے شرم نہیں آتی؟“

امجد کا دل دھڑکنے لگا کہ اس کی شکایت اگر اس کے بھائی تک پہنچ گئی تو اس کی پھر خیر نہیں۔ اس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ کھیرے بازار سے خرید کر لا رہا ہوں۔“

لڑکا بولا۔ ”اگر بازار سے لا رہے تھے تو کرتے کے اندر کیوں چھپا رہے تھے۔“

امجد سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ لاجواب سا ہو گیا۔ لڑکا پھر بولا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ تمہارا سلوک مجھ سے ہی برا تھا، لیکن مجھے اب معلوم ہوا کہ تم اپنے ہمسایوں سے بھی برا سلوک کرتے ہو اور ہمسایہ بھی کون، ایک اندھی بڑھیا جو تم سے بھی زیادہ غریب ہے۔ کیا پڑوسیوں کا حق اسی طرح ادا کرتے ہیں۔“

اس بات پر امجد کو سخت تاؤ آیا اور وہ پاجامے کے نیفے سے چمک دار چھُرا نکال کر بولا۔ ”خبردار! اب ایک لفظ زبان سے نہ نکالنا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی

نہ ہو گا اور نہ ہی یہ بات کسی کو معلوم ہو۔ دھیان میں رکھنا۔"

لڑکا چھُرا دیکھ کر سکتے میں آ گیا اور چُپ ہو گیا۔ لیکن امجد کی طرف سے وہ اس نفرت کی آنکھوں سے دیکھنے لگا جیسے اگر اس کا بس چلتا تو اس کے مُنہ پر تھوک دیتا۔ امجد بولا۔ "میں اب تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اسکول میں آئندہ کوئی لڑکا تنگ نہیں کرے گا لیکن تمہیں میرے حکم پر چلنا پڑے گا۔ تم نے اگر میرے خلاف کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں کسی کی پروا نہیں کرتا ہوں۔ ویسے تم میرے دوست ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم امیر آدمی کے بیٹے ہو اور تمہارے پاس کھانے پہننے کو ساری چیزیں میسر ہیں۔ لیکن ہم غریب ہیں اور ہماری ضرورت کبھی پوری نہیں ہوتی۔ اگر آئندہ تم نے کسی کو دھونس دینے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر امجد چلتا بنا۔ نیا لڑکا اسے تھوڑی دیر جاتا ہوا دیکھتا رہا لیکن جب وہ گلی کو پار کر کے آگے مڑ گیا اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لڑکا اپنے

گھر کی طرف چلنے لگا۔ راستے بھر اسے طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے رہے اور وہ سوچتا رہا کہ اس گاؤں میں اس کا گزارہ مشکل ہے۔ وہ اس سے پہلے شہر کے انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا اور اسے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، گفتگو کرنے، ہاتھ ملانے، غرض ہر چیز کی تربیت دی گئی تھی، لیکن اب جبکہ شہر کے اسکول سے اس کے باپ نے گاؤں بلا لیا تھا۔ اب اسے انہی اجڈ اور گنوار لوگوں میں گزارا کرنا تھا۔ انہیں کی راہوں پر چلنا تھا اور انہی کی طریق زندگی کو اپنانا تھا۔ اس کا باپ خود نہایت رحم دل آدمی تھا۔ اس نے اسکول کی عمارت کو پختہ بنانے کے لئے دس ہزار روپے چندہ دیا تھا اور اسے سیکرٹری کا اعزاز بخشا گیا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو یہ ہدایت دی تھی کہ گاؤں کے لوگوں سے زیادہ میل جول نہ رکھے۔ ان لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ کرے کیونکہ یہ اچھے لوگ نہیں ہوتے، گندے ہوتے ہیں۔

لڑکا گھر تک یہی باتیں سوچتا رہا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ ان لڑکوں میں

گھومے پھرے۔ ان کے کھیلوں میں حصّہ لے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہو۔ لیکن باپ کے حکم کے آگے اس کی کچھ نہ چلتی۔ وہ شام کو اسی طرح مُنہ لٹکائے غمگین سا گھر واپس آگیا اور آکر تکیے میں منہ لپیٹ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ پھر اس کے ذہن میں اندھی بُڑھیا کی غربت نظر آئی اور وہ تیز تیز ہچکیاں لینے لگا۔ جیسے یہ بُڑھیا اس کی کوئی بہت قریبی رشتے دار ہو اور وہ اسی طرح روتا روتا سو گیا۔

نیکی کا فرشتہ

رات کو جب امجد کے بھیّا صحن میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے تو امجد کی بھابھی میکے سے اپنی امّاں کے خط کے بارے میں ذکر چھیڑ بیٹھیں۔

امجد کے بھیّا کھانا کھاتے ہوئے بولے۔ ”کیا لکھا ہے تمہاری امّاں نے؟“

امجد کی بھابھی خط کو آنچل سے کھولتی ہوئی بولی۔ ”لکھا ہے کہ ابّا جان کی وفات کے بعد گھر اکیلا رہ گیا ہے۔ ہر بات کی تکلیف ہے، کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔“

پھر بھابھی بولی۔ ’’آپ چاہیں تو اُن کو یہاں بُلوالوں؟‘‘

امجد کے بھیّا بولے۔ ’’تو بلوالو نا۔ اس میں میری رائے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں آجائیں گی تو تمہارا بھی دل لگے گا اور ان کا بھی۔ پھر گھر کے کام میں تھوڑا بہت ہاتھ بھی بٹائیں گی۔‘‘

امجد کی بھابھی نے کہا۔ ’’بس تو پھر میں آج ہی خط لکھ کر بُلوا لیتی ہوں۔‘‘

امجد کے بھیّا کھانا ختم کر کے اُٹھے اور حقّہ لے کر بیٹھک میں چلے گئے۔ امجد نے جب دیکھا کہ بھیّا جا چکے ہیں تو وہ کھانے کے لئے بھابھی کے پاس آیا۔ آتے ہی گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ بولا۔ ’’بھابھی میری بھُوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ کھانا دو۔‘‘

بھابھی نے جھٹ سے کہا، ’’کیوں رے، کھیرے سے پیٹ نہیں بھرا؟‘‘

’’کیسا کھیرا؟‘‘ امجد نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

’’کہتا ہے کیسا کھیرا۔ مجھے سب پتہ ہے۔ میں نے تجھ سے کیا کہا تھا کہ

شرارتیں چھوڑ دے۔"

"بس بھابھی یہ آخری غلطی تھی۔ اس کے بعد تمہیں شکایت کا موقع نہ ملے گا۔" امجد معافی مانگتے ہوئے بولا۔

"کم از کم یہ بھی تو سوچا کر کہ اس میں تیرے بھائی کی بدنامی ہوتی ہے۔" بھابھی بولی۔

"بھیّا کو معلوم تو نہیں ہو گیا؟" امجد گھبر اگیا۔

"بتادوں انہیں؟" بھابھی نے شرارت سے پوچھا۔

امجد بھابھی کے گلے سے لپٹ گیا اور ضد کرتے ہوئے بولا۔ "میری اچھی بھابھی!"

بھابھی بولی۔ "اچھا تو دیکھ اب تو جا کر اس بُڑھیا سے معافی مانگ لے اور یہ اٹھنّی بھی اُسے آج کے نقصان کا جرمانہ دے دینا۔" بھابھی اٹھنّی اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا بھابھی۔" امجد بولا۔ "یہ بات خود بُڑھیا نے تمہیں بتائی؟"

"ہاں۔" بھابھی بولی۔

امجد نے کھانا جیسے تیسے ختم کیا اور سیدھا اُٹھ کر اندھی بُڑھیا کی جھونپڑی کی طرف چلا۔ جیسے ہی وہ بُڑھیا کے پاس پُہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بُڑھیا اکیلی دہلیز پر بیٹھی رو رہی ہے۔ امجد کا دل بھر آیا اور اُسے بڑی شرم محسوس ہوئی اور اُسے اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔ وہ سیدھا بُڑھیا کے پاس گیا اور بولا۔ "مائی کیوں رو رہی ہے؟"

"چل ہٹ بے حیا۔ لٹیرا!" بُڑھیا امجد کی آواز پہچان کر کوسنے لگی۔

امجد نے اس کے ہاتھ پر اٹھنّی رکھ دی اور بولا۔ "مائی، مجھے معاف کر دے۔ میں اب کبھی تجھے تنگ نہ کروں گا۔"

بڑھیا نے اٹھنّی پا کر امجد کو دعائیں دیں اور بولی۔ "بیٹا، ہم غریب پڑوسیوں کا خیال رکھا کرو۔ ہمارا اور کون ہے۔"

امجد اُسے دلاسا اور تسلّی دیتا ہوا ہر ممکن مدد کا وعدہ کرنے لگا۔ یکایک بُڑھیا زور زور سے رونے لگی۔ امجد حیران ہو گیا اور بولا۔ ”کیوں مائی، رو کیوں رہی ہے تو؟“

بُڑھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا وہ جو ڈاکٹر ہے نا؟ وہ میری بکری پکڑ کر لے گیا۔ کہتا ہے دوا کے دام چُکا دوں تو واپس دے گا۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں کہ میں بکری کو واپس لاؤں۔“

امجد نے کہا۔ ”تو پھر فکر نہ کر مائی، میں ابھی ڈاکٹر کو ٹھیک کر دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ سیدھا ڈاکٹر کے گھر کی طرف بڑھا اور تیز تیز چلنے لگا۔ اسے اس وقت ڈاکٹر کی کمینگی پر بے حد غصّہ آ رہا تھا۔ وہ ایک غریب بُڑھیا کا آخری سہارا چھین رہا تھا اور یہ امجد کو برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑھیا کی اس امانت کو ہر قیمت پر واپس لا کر رہے گا۔ جب وہ ڈاکٹر کے گھر کے پاس پہنچا تو اس وقت باہر کا دروازہ کھُلا ہوا تھا لیکن اُس نے جھانک کر دیکھا تو بُڑھیا کی بکری اندر صحن میں بندھی ہوئی تھی اور

اس کے سامنے ڈاکٹر بر آمدے میں بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔

وہ اندر داخل ہو گیا اور چھُپ کر بوریوں کے پیچھے دُبک گیا اور اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ ڈاکٹر کھانا ختم کر کے اُٹھے اور کمرے میں جائے تو وہ بکری کو کھول کر چلتا بنے، لیکن ڈاکٹر کم بخت اس بُری طرح کھانے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

آخر اس کا بیٹھے بیٹھے جی اُکتا گیا۔ اُس کی گردن اکڑ کر دکھنے لگی۔ وہاں پر بوری کے پیچھے بہت چھوٹی سی جگہ تھی اور وہ بڑی تکلیف سے کسی طرح چھپا بیٹھا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر نے بیوی کو پکارا۔ ”ارے سنتی ہو۔۔۔؟“

اس کی بیوی باورچی خانے سے نکل کر آئی اور بولی۔ ”کیا بات ہے؟“

ڈاکٹر لقمہ نگلتے ہوئے بولا۔ ”کل صبح ہی اُٹھ کر مصالحہ پیس رکھنا۔ بکری ذبح ہو گی کیونکہ بُڑھیا صبح تک آفت لے آئے گی۔“

اس کی بیوی بولی۔ ”مصالحہ تو میں نے پیس کر بھی رکھ دیا۔ اب صبح

قصائیوں کو بُلوا کر اِسے ذبح کرادو اور قصّہ ختم۔"

ڈاکٹر ہاتھ دھوتا ہوا بولا۔ "بس ٹھیک ہے۔"

اور پھر تولئے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اُس کی بیوی بھی چلی گئی۔ امجد کے لئے اب موقع تھا کہ وہ بکری کو رسّی سے کھول کر چلتا بنے۔ آنگن میں اس وقت اندھیرا ابھی تھا۔ امجد بجلی کی تیزی سے اُٹھا اور جا کر اس نے رسّی کھول دی اور بکری لے کر جلدی جلدی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن شامت دیکھئے کہ بکری ٹھیک اسی وقت ممیا اٹھی۔ ڈاکٹر نے جب بکری کے دروازے سے ممیانے کی آواز سُنی تو وہ لپکا ہوا بھاگا۔ امجد کے ایک ہاتھ میں رسّی تھی جو بھاگنے میں دروازے کے ساتھ پھنس گئی۔ امجد ایک ہاتھ میں بکری کو پکڑے رہا اور دوسرے ہاتھ سے رسّی کو کھینچنے لگا لیکن اندھیرے میں اسے پتا نہ چل سکا کہ رسّی کہاں پھنسی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے آکر دروازے کے پاس بکری کو ٹٹولنا شروع کر دیا اور اس کے ہاتھ میں رسّی آگئی۔ اس نے سمجھا کہ

بکری مل گئی اور خوب زور زور سے کھینچنے لگا۔

امجد نے جب دیکھا کہ ڈاکٹر سارا زور لگا کر کھینچ رہا ہے تو اس نے رسّی چھوڑ دی۔ ڈاکٹر دھڑام سے جھٹکا کھا کر ِگر پڑا اور اس کا سر زخمی ہو گیا۔ ڈاکٹر زور زور سے چیخ کر بیوی کو بُلانے لگا اور امجد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر آ گیا اور بکری کو گود میں اٹھائے ہوئے بڑھیا کی جھونپڑی کو پہنچ گیا۔

اس نے بکری کو آہستہ سے چھوڑ دیا اور بکری چلتی ہوئی بڑھیا کے پاس پہنچ گئی۔ بڑھیا کو پتہ نہ چلا کہ امجد ہی بکری کو چھوڑ گیا ہے۔ بڑھیا بکری کو پا کر خوشی سے اُچھل پڑی اور اس سے لپٹ کر پیار کرنے لگی۔ امجد کی آنکھوں سے خوشی کے مارے آنسو نکل آئے اور اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اس نے کوئی نیک کام کیا ہے اور امجد خوشی خوشی گھر لوٹ آیا اور اس رات وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ بُڑھیا کے کسی کام آ گیا اور اسے بہت اچھی نیند آئی۔

نئی آفت

صبح سویرے جب امجد کی آنکھ کھلی تو اس نے بھابھی اور بھیّا کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ بھابھی بھیّا سے کہہ رہی تھیں۔ ”آپ جا کر آج میری ماں کو دریا کے گھاٹ سے لے آئیں۔ وہ کشتی پر دریا پار آئیں گی۔“

امجد کے بھیّا دفتر جانے کی تیّاری کر رہے تھے۔ وہ بولے۔ ”بھئی مجھے تو دم لینے کی بھی فرصت نہیں۔ اچھا ہوتا کہ تم امجد کو بھیج دیتیں۔“

بھابھی کو غصّہ آگیا، وہ بولیں۔ ”اس طرح اگر کوئی انہیں لینے نہ گیا تو وہ یہی کہیں گی کہ میرا آنا بہت جبر تھا۔ کوئی لینے تک نہ آیا۔“

امجد کے بھائی تیّاری کر کے دفتر چلے گئے اور جاتے جاتے کہہ گئے کہ امجد کو بھیج دینا۔ وہ جا کر لے آئے گا۔ آخر بھابھی بھی نااُمّید ہو کر امجد کے پاس آئی اور بولی۔ ”راجہ بھیّا! آج میرا کام کرو گے؟ میری ماں آج آ رہی ہے، تو ذرا گھاٹ پر لینے چلا جا۔“

امجد بھیّا کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ ”بھئی مجھے تو دم لینے کی فرصت نہیں، اچھا ہوتا کہ تم بھیّا ہی کو بھیج دیتیں۔“

بھابھی بولی۔ ”اچھا مذاق ہو چکا۔ اگر تم میں سے کوئی نہیں گیا تو ماں بہت برا منائے گی۔“

امجد بولا۔ ”تو اسکول بھی تو جانا ہے۔“

”اسکول سے چھٹّی لے لینا۔“ بھابھی بولی۔

امجد نے سوچا کہ چلو مُفت کی چھٹّی بھی مل جائے گی اور دریا گھاٹ کی سیر بھی ہو جائے گی اور بھابھی کا دل بھی خوش ہو جائے گا۔ اس لئے اُس نے بھابھی کو کہہ دیا کہ وہ اس کی ماں کو لینے دریا گھاٹ پر چلا جائے گا۔ بھابھی یہ سُن کر بہت خوش ہوئی اور امجد کو پیار کرتے ہوئے بولی۔ "واہ۔ میرا راجہ بھیّا کتنا اچھا ہے۔ میری بات مان گیا۔"

امجد اٹھا، کپڑے پہنے، غلیل ہاتھ میں پکڑی اور بھابھی نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "امجد راستے میں شیطانی نہ کرنا اور میری ماں سے ایسی ویسی بات نہ کرنا ورنہ برا مانے گی۔"

"اچھا۔ اچھا۔" امجد جلدی سے دروازے سے نکلتا ہوا بولا۔

دریا کے اُس طرف گنّے کا کھیت پڑتا تھا۔ امجد تیزی سے کھیت میں گیا اور ایک خوب موٹا سا گنّا چھرے کے ایک جھٹکے سے اُڑا کر ایسا چلتا بنا کہ گنّا کاٹنے کی آواز تک پیدا نہ ہوئی۔ اس نے گنّے کو دانت سے چھیلنا شروع کیا اور اِسی طرح چھیلتا ہوا دریا کے گھاٹ پر پہنچ گیا۔

ابھی ناؤ آنے میں کافی دیر تھی۔ وہ گھاٹ پر بیٹھ گیا اور مزے مزے لے لے کر گنّا چوسنا شروع کر دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ناؤ آتی ہوئی نظر آئی۔ صبح کا سورج اس وقت ذرا ہی اوپر چڑھا تھا اور دور تک ناؤ کی سیدھ میں پانی کی چمک ایک روشنی کی لکیر کی طرح پانی کے اوپر کھچی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور کشتی کا بادبان سورج کی روشنی میں دور سے چمکتا ہوا ہواؤں میں کلیل کرتا تھا۔ مُرغابیاں چکّر کاٹ رہی تھیں اور کونج ایک قطار میں اُڑتی ہوئی نیلے آسمان پر سفید پروں کا پنکھا کر رہی تھیں۔ ساری چیزیں ایک زندگی اور خوبصورتی لئے ہوئے تھیں۔

امجد اس خوبصورت منظر میں ایک دم کھو سا گیا اور اُسے اپنے اِدھر اُدھر کا ہوش نہ رہا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دریا کی سیدھ میں بہت دور تک دیکھے جا رہا تھا اور اُس کی آنکھیں پانی کے ٹھہرے ہوئے قطروں کی طرح معلوم ہو رہی تھی جیسے ابھی اُس کے پپوٹوں کے نیچے سے ڈھلک کر گِر جائیں گی۔ امجد اِس منظر کی خوب صورتی میں ایسا کھویا کہ اُسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ

اب ناؤ اس کے بہت قریب آ کر گھاٹ پر لگ گئی ہے اور مسافر کشتی سے نیچے اُتر رہے ہیں۔

امجد کا دھیان اس وقت پلٹا جب ایک بوڑھی عورت جو موٹاپے کی وجہ سے بمشکل چل سکتی تھی، ایک آدمی سے پوچھ رہی تھی۔ ”بھائی! ارشد بابو کا مکان کون سا ہے؟“

ارشد امجد کے بھیّا کا نام تھا۔ امجد سمجھ گیا کہ یہ بڑھیا ہی اس کی بھابھی کی ماں ہے۔ وہ آگے بڑھا اور بولا۔ ”کہاں سے آ رہی ہو بیگم صاحبہ؟“

بڑھیا نے اسے قہر آلود آنکھوں سے دیکھا اور ایک طرف ہٹ گئی اور پھر ایک دوسرے آدمی سے بولی۔ ”کیوں بھیّا۔ ارشد بابو کے گھر کا پتہ ہے تمہیں؟“ اس آدمی نے امجد کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ ارشد کا چھوٹا بھائی امجد ہی تو ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے تمہیں لینے آیا ہے۔“

امجد آگے بڑھا اور بولا۔ ”مگر تم آئی کہاں سے۔ کون ہو؟ کیا نام ہے۔“

بڑھیا بولی۔ ”ہٹ بد زبان۔ مجھ سے میرا نام پوچھتا ہے۔ نام پوچھ اپنی ماں سے۔ اپنی بہن سے۔“

امجد بولا۔ ”مجھے ان کا نام معلوم ہے۔ کیوں پوچھوں؟“

بڑھیا فریاد کرتی ہوئی بولی۔ ”ہائے کیسا مسٹنڈا لونڈا ہے۔ کس دیدہ دلیری سے بولے جا رہا ہے۔ دیدے کا پانی مر گیا ہے کم بخت کا۔“

امجد بولا۔ ”کیوں خواہ مخواہ کو کوس رہی ہو۔ بھابھی نے اگر منع نہ کیا ہوتا تو میں تمہیں جواب دے دیتا مگر اس کا خیال کر کے تمہیں چھوڑ دیتا ہوں، سیدھی طرح گھر چلو۔“

بڑھیا کے ساتھ ایک وزنی سی گٹھڑی تھی۔ امجد نے اُسے اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور بولا۔ ”اب قدم بھی اٹھاؤ گی یا پہاڑی بنی یہیں کھڑی رہو گی۔“

بڑھیا غصے کو پی گئی اور کچھ نہ بولی۔ بلکہ پیچھے مُڑ کر ایک لڑکی کو آواز دینے لگی۔ ”چل مُنّی۔ چل۔“

امجد نے بڑھیا کے پیچھے دیکھا کہ ایک دس گیارہ سال کی بچی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ امجد ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور بالوں کا بڑا خوب صورت سا جوڑا بنا کر پیچھے اس میں پھول کا ہار لگا رکھا تھا۔ لڑکی بھی امجد کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

اپنی نانی کی آواز پر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور چلنے لگی۔ امجد گٹھری کو چلتے چلتے ہوا میں اُچھالتا اور پھر زمین پر گرنے سے صاف بچا لیتا۔ بڑھیا کا کلیجہ راستے بھر دھک دھک کرتا رہا پر وہ منہ سے کچھ نہ کہتی۔ کیونکہ وہ خود گٹھری کا وزن برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے تو چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ آخر کسی نہ کسی طرح وہ گرتی پڑتی گھر پہنچ گئی۔

بھابھی ماں کے انتظار میں دہلیز ہی پر ببّو کے ساتھ کھڑی تھی۔ ماں کو دیکھ کر بھابھی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ آگے بڑھ کر ماں سے گلے مل کر رونے لگی۔

جب گلے مل کر وہ علیحدہ ہوئیں تو ماں کو لے کر وہ اندر آنگن میں آئی۔

بڑھیا چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے پسینہ بری طرح چل رہا تھا۔ وہ آنچل سے پنکھا کرتی ہوئی بولی۔ ”بیٹی یہ مُوا کون ہے؟“

بھابھی بولی۔ ”ماں یہ میرا چھوٹا دیور امجد ہے نا۔ تمہیں یاد نہیں؟“

بڑھیا منہ لٹکاتے ہوئے بولی۔ ”اچھا تو یہ ہے وہ لونڈا۔ یہ لچھّن ہیں اس کے۔ یہ تو بڑا بد معاش معلوم ہوتا ہے۔ راستے بھر گٹھری گراتا اٹھاتا آیا ہے۔“

بھابھی بولی۔ ”کیوں رے امجد؟“

امجد بولا۔ ”مُنّی سے پوچھ لو۔ میں بولوں گا تو جھوٹ سمجھو گی۔“

مُنّی بولی۔ ”نہیں خالہ ذرا سا گٹھری کو ہوا میں اچھال رہے تھے یہ۔“

بھابھی بولی۔ ”بڑا شریر بچہ ہے ماں!“

بڑھیا بولی۔ ”اسے تو بچّہ کہہ رہی ہے؟ یہ تو جوان لونڈا ہے۔“

بھابھی امجد کی حمایت میں بولی۔ ”ماں تم بھی کمال کرتی ہو۔ مُشکل سے نو

سال کا ہوا ہے۔ یہ کوئی جوان تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔"

بڑھیا اس پر غصّے میں بولی۔ "دھاکڑ جیسا لونڈا ہے۔ یہ اس کے کھیلنے کے دن ہیں؟۔۔۔ہاں تمہارا بچّہ کہاں ہے؟"

بھابھی نے ببّو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ارے ببّو نانی کو سلام نہیں کیا؟"

ببّو نے ہاتھ سے سلام کیا۔ نانی نے ببّو کو ساتھ لے کر بلائیں لیں اور بولی۔ "کیوں ببّو؟ مٹھائی کھائے گا بیٹا۔"

ببّو بولا۔ "ہاں کھاؤں گا۔"

بڑھیا نے وہی گٹھری کھولی اور اس کے اندر سے مٹھائی نکال کر ببّو کے ہاتھ میں رکھ دی۔ پھر مُنّی سے بولی۔ "مُنّی! تو بھی کھائے گی؟"

"ہاں۔" مُنّی بولی۔ اور ایک مٹھائی کا ٹکڑا مُنّی کو بھی مل گیا۔ بڑھیا نے

جلدی سے گٹھری میں گرہ باندھ کر الگ رکھ دیا۔ اس پر بھابھی بولی۔
”ماں۔ تم نے امجد کو مٹھائی نہیں دی؟“

بڑھیا بولی۔ ”نہیں۔ میں یہ مٹھائی اپنے نواسے کے لیے لائی ہوں۔ میں ایرے غیرے نتھو خیرے کے لیے نہیں لائی ہوں۔ تم بُرا مانو یا بھلا۔ میں تو دوٹوک کہتی ہوں۔“

بھابھی کو ماں کی یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی اور اس کا چہرہ ذرا بجھ سا گیا۔ امجد نے بھابھی کی طرف دیکھا اور بھابھی نے سر نیچے جھکا لیا۔ امجد نے شرارت سے کہا۔ ”بھابھی تم فکر نہ کرو۔ میں رات کو اپنے حصّے کی مٹھائی چُرا کر کھالوں گا۔“

بڑھیا چونک کر بولی۔ ”کیا بکتا ہے؟ چُرا کر کھائے گا۔ تو تجھے چوری کی بھی لت پڑی ہوئی ہے؟ چُرا کر دیکھ تو ذرا۔ منہ میں آگ نہ لگادوں گی تیرے!“

بھابھی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ امجد بھی یہ محسوس کر کے کہ بات آگے نہ بڑھ جائے، چُپ چاپ باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر وہ سر جھکائے باغ کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے بڑھیا سے ایک طرح کی نفرت ہو گئی اور اسے ایسا لگا جیسے وہ بڑھیا گھر میں اس کا جینا دو بھر کر دے گی۔ اسے پھر یہ بھی خیال آیا کہ شاید اس کی بھابھی بھی اب اس کے ساتھ زیادہ پیار نہ کرے گی اور وہ اپنی ماں کے کہنے میں آ کر امجد کے ساتھ بُرا سلوک کرے گی۔ اس بات کو سوچ کر امجد کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے سسکی بھر کے رونا شروع کر دیا۔

باغ کے پاس ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے وہ بڑی دیر تک روتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس بڑھیا نے اس کی بھابھی کو اس سے چھین لیا ہے اور اب وہ کبھی بھی اس سے پیار نہ کرے گی۔ وہ اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب اس کا رو کر جی ہلکا ہوا تو اس نے آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور دیر تک درخت کے نیچے آنکھ بند کر کے لیٹا رہا۔ پھر اسے مُنّی کا خیال آیا۔ اس کی طرف سے تھوڑی سی ہمدردی کا خیال تھا۔ وہ کتنی پیاری لڑکی تھی۔ امجد نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اسے کسی نے پیار نہ بھی کیا تو وہ مُنّی

کو اپنا دوست بنائے گا اور اسے اپنے دکھ درد کا ساتھی سمجھے گا۔ لیکن کیا پتا کہ مُنّی بھی نانی کے ڈر سے اس سے باتیں نہ کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ ببّو اس کے بھائی کا بیٹا ہے۔ اسے کوئی نہیں اس سے چھین سکتا۔ یہ سوچ کر اسے ڈھارس سی ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف لوٹنے لگا۔

نیا فساد

صبح حسب معمول امجد اسکول کی تیاری کرنے لگا اور بستہ دبا کر اسکول کو نکل گیا۔ آج وہ کچھ اداس سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسکول میں چُپ چاپ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے قریب ہی تین چار لڑکے آپس میں زور زور سے بحث کر رہے تھے۔ بحث اس بات پر ہو رہی تھی کہ دنیا چاند اور ستارے کی طرح ایک سیّارہ ہے۔ امجد نے کہا یہ دنیا تو خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں سائنس کا کیا کام ہے۔

نیالڑکا بولا۔ ”آج کل سارا کام سائنس سے ہو رہا ہے۔ اس میں مذہب کا کیا کام ہے؟“

امجد کو غصّہ آگیا اور وہ بولا۔ ”مگر میری بھابھی تو کہتی ہے کہ ساری دنیا خدا نے سات دن میں بنائی ہے۔“

نیالڑکا ہنس پڑا اور بولا۔ ”میں نہیں مانتا۔“

امجد بولا۔ ”تو کیا میری بھابھی غلط کہتی ہے؟“

نیالڑکا بولا۔ ”بالکل غلط۔“

امجد سے اب غصّہ برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اچھل کر نئے لڑکے کو گردن سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”میری بھابھی کو جھٹلاتا ہے۔“

اور ساتھ ہی ساتھ اس نے مکے، ہاتھ پاؤں سے اسے اتنا مارا کہ وہ لڑکا بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ تمام لڑکے جمع ہو گئے اور گھبرا گئے کہ سیکرٹری صاحب کا لڑکا بے ہوش ہو گیا۔ ماسٹر صاحب کو

جیسے ہی اس بات کا پتہ چلا وہ بھاگے ہوئے آئے اور لڑکے کو اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔ کوٹھی کے برآمدے میں لڑکے کے باپ سیکرٹری صاحب بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ جب اسکول کے ماسٹر صاحب ان کے لڑکے کو لے کر پہنچے تو سیکرٹری صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ قصہ کیا ہے۔ انہوں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے۔ اس پر اسکول کے ماسٹر نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ امجد نے اسے لڑائی میں گرا دیا ہے اور وہ اسکول کو بند کر کے آ گئے ہیں۔

سیکرٹری کرسی سے اٹھا اور اپنے بیٹے کو اندر گھر میں جانے کے لیے کہا اور خود ماسٹر صاحب سے بولا۔ "ماسٹر صاحب امجد نے میرے بیٹے کو اس لیے مارا کہ میرا بیٹا کمزور تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس میں اسکول بند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ فوراً جا کر اسکول کھولیں اور پڑھائی شروع کریں۔ ماسٹر صاحب سلام کر کے واپس اسکول آ گئے اور وہاں انہوں نے دوبارہ پڑھائی شروع کر دی۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ بات پورے گاؤں میں

پھیل گئی کہ امجد نے اسکول کے سیکرٹری صاحب کے لڑکے کو پیٹا ہے۔

شام کے وقت جب امجد کے بھیّا دفتر سے واپس لوٹے اور ہاتھ منہ دھو کر وہ دفتر کے کاغذات لے کر بیٹھے۔ تھوڑا سا کام کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں اسکول کے سیکرٹری صاحب کی موٹر باہر آکر رُکی اور اس میں سے اسکول کے سیکرٹری باہر نکل کر آئے اور امجد کے بھیّا کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ امجد کے بھیّا ان کی اس غیر متوقع آمد سے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام عرض کیا۔

اسکول کے سیکرٹری صاحب نے بڑے غصے سے پوچھا۔ "کیوں صاحب؟ امجد آپ ہی کا چھوٹا بھائی ہے؟"

امجد کے بھیّا گھبرا گئے اور بڑی ملائمت سے بولے۔ "جی ہاں۔"

اسکول کے سیکرٹری صاحب بولے۔ "آپ اپنے بھائی کو ذرا سمجھا دیجیے گا۔"

یہ کہہ کر وہ کار میں بیٹھے اور چلے گئے۔ امجد کے بھیّا فوراً اندر چلے گئے اور بیگم سے بولے۔ ”دیکھو۔ آج امجد نے ایک اور ہنگامہ کھڑا کیا۔ ابھی ابھی اسکول کے سیکرٹری صاحب آئے تھے۔“

امجد کے گھر میں سبھوں کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی اور خاص طور پر بڑھیا تو اس خبر کو سنتے ہی خوش ہوئی تھی کہ آج وہ امجد کی بھائی سے خوب مرمت کرائے گی۔ وہ امجد کے بھیّا سے بولی۔ ”اجی یہ لڑکا تو نِرا شیطان ہے۔ تمہاری عزّت کو چار کوڑی کی بنا کر رکھ دے گا۔“

امجد کے بھیّا کو سخت غصہ آیا اور وہ امجد کی بھابھی سے بولے۔ ”میں اور امجد اپنا گھر علیٰحدہ علیٰحدہ کر لیں گے۔ وہ آئندہ میرے ساتھ نہیں رہے گا۔“

امجد کی بھابھی بولی۔ ”آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ اتنا چھوٹا سا بچہ اکیلے کیسے رہے گا۔ لڑکے تو شرارت کرتے ہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ گھر سے نکال دیں۔“

لیکن امجد کے بھیّا بولے۔ ”نہیں میں سوچ چکا ہوں۔ وہ لونڈا روز روز ایسی ہی مصیبتیں کھڑی کرتا رہے گا۔ اکیلے رہ کر جو جی چاہے کرتا پھرے۔“

بھابھی پھر بولی۔ ”تو اپنا گھر خود سنبھال لیجیے۔ میں تو کنویں میں جا کر ڈوب مروں گی۔“

امجد کے بھیّا بولے۔ ”تم نے ہی تو طرف داری کر کر کے لونڈے کا دماغ عرش پر چڑھا دیا ہے۔ تمہاری وجہ سے وہ اتنا شوخ اور شریر ہو گیا ہے۔“

امجد کی بھابھی چپ ہو گئی۔ اتنے میں امجد آہستہ سے اندر داخل ہوا اور کمرے میں چلا گیا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ امجد کی بھابھی بھی چپ چاپ اٹھی اور امجد کے کمرے میں گئی اور دیوار کے پاس سے چھڑی اٹھا کر اس نے امجد کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ پیٹتی گئی۔ پیٹتی گئی۔ امجد کا سارا جسم چھلنی ہو گیا اور اس کی چیخیں سارے محلے میں سنائی دینے لگیں۔ کوئی بیس منٹ تک پیٹنے کے بعد وہ تھک گئی تو واپس باہر آ گئی۔ امجد درد سے تڑپ تڑپ کر لوٹ رہا تھا۔

امجد کے بھیّا بولے۔ ”اس طرح بھی کوئی مارتا ہے بچے کو۔“

امجد کی بھابھی بولی۔ ”اب تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا دیکھنے والوں کا۔“ اور یہ کہہ کر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر کے تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

اس رات امجد اور امجد کی بھابھی دونوں میں سے کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ دونوں اسی طرح چپ چاپ سو گئے۔

لیموں کا درخت

دوسرے دن جب امجد اسکول سے چھٹی کے بعد شام کو گھر لوٹ رہا تھا، راستے میں اس نے ایک کوڑے کرکٹ کے اوپر ایک سبز سا پودا دیکھا۔ پودا ابھی بہت چھوٹا تھا اور مشکل سے اس میں چھ یا سات پتیاں نکل سکی تھیں۔ امجد نے ایک پتی کو توڑ کر انگلیوں سے مسلا اور اسے سُونگھنے لگا مگر اسے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ یہ کس چیز کا درخت تھا۔ اس نے تین چار پتیوں کو توڑ کر سُونگھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اب پودے میں صرف ایک پتّی رہ گئی تھی۔ اس نے غصّے میں اسے بھی نوچ ڈالا اور ہاتھ

میں پتّی کو لیے ہوئے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر بعد جب انگلی کو ناک کے پاس لے گیا تو اُسے لیموں کی بھینی بھینی خوش بو محسوس ہوئی۔ امجد کو افسوس ہوا کہ لیموں کا ایک درخت خواہ مخواہ خراب ہو گیا اور امجد کو درخت لگانے کا بھی بہت دنوں سے شوق تھا۔ اسے یہ دھن سمائی کہ لیموں کا درخت اپنے آنگن میں ضرور لگانا چاہیے۔ پھر اسے یاد آیا کہ لالہ کے باغ میں لیموں کے بہت سے درخت ہیں۔ کوئی چھوٹا موٹا اکھاڑ کر اپنے آنگن میں لگا لینا چاہیے۔ چنانچہ یہ سوچتے ہی وہ لالہ کے باغ کی طرف ہو لیا اور وہاں پہنچ کر اُس نے اِدھر اُدھر کوئی چھوٹا درخت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہاں آس پاس سارے درخت بڑے بڑے تھے۔ چھوٹا درخت کوئی بھی نہ تھا۔ آخر مجبور ہو کر امجد نے ایک بڑا درخت چھُرے سے کاٹنا شروع کر دیا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد درخت کٹ گیا تو امجد اسے گھسیٹتا ہوا گھر کی طرف لانے لگا۔ راستے میں اسے ببّو آتا ہوا دکھائی دیا۔ ببّو نے پوچھا۔

”امجد بھیّا یہ درخت کیا کرو گے۔“

امجد نے بستہ ببّو کو پکڑا دیا اور بولا۔ ”اسے آنگن میں لگائیں گے۔“

ببّو خوشی کے مارے اچھل پڑا اور دونوں مل کر لیموں کے درخت کو آنگن میں لے آئے۔ اس وقت نانی چولہے کے پاس بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ وہ دیکھ کر وہیں آگ بگولا ہو گئی اور بولی۔

”یہ کیا گھاس کوڑا گھر میں اٹھا لایا ہے؟“

امجد بولا۔ ”گھاس کوڑا نہیں۔ یہ لیموں کا درخت ہے۔ یہ آنگن میں لگاؤں گا۔“

نانی کا غصّہ اور بھی تیز ہو گیا اور بولی۔ ”یہ نجس درخت گھر میں لگائے گا؟“

امجد بولا۔ ”یہ کس حکیم نے بتلایا ہے کہ یہ درخت نجس ہے؟“

بڑھیا بولی۔ ”لونڈے، ہوش کی دوا کر، بال بچّے والے گھر میں یہ درخت لگے گا؟ خدا نہ کرے میری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو۔“

امجد بولا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ کچھ نہیں ہو گا اور یہ درخت یہیں لگے گا۔“

بھابھی اس وقت پانی کا گھڑا کنویں سے بھر کر لا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”یہ کیا اٹھا لایا ہے رے امجد۔“

امجد بھابھی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”لیموں کا درخت۔“

بھابھی یہ سوچ کر چُپ ہو گئی کہ کل ہی اس نے اتنا پیٹا ہے اب آگے اس سے بولنا اچھا نہیں۔ مگر بڑھیا تو جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ وہ سر ہو گئی۔

”کان کھول کر سُن لے بیٹی۔ یہ درخت منحوس ہوتا ہے۔ ہری گود سوکھ جاتی ہے۔ میں اس منحوس کا سایہ اس گھر میں نہیں دیکھ سکتی۔“

بھابھی بولی۔ ”ماں! لگا لینے دو اسے۔ اب یہ اتنا بڑا درخت کیا لگے گا۔ خود ہی دو دن میں سوکھ جائے گا اور امجد باہر پھینک دے گا۔ بچّے کے ساتھ بچّہ بننے کا کیا فائدہ؟“

بڑھیا اس وقت تو چُپ ہو گئی مگر دل میں خار کھا بیٹھی کہ کب موقع ملے اور

وہ اس درخت کو اکھاڑ پھینکے۔ امجد اور ببّو نے مل کے خوب بڑا سا گڑھا کھودا اور اس میں درخت کو گاڑ کر اُوپر سے مٹّی بھر دی۔ امجد کنویں سے دس بارہ بالٹی پانی لا کر جڑ میں دیتا رہا۔ اب درخت اچھی طرح جم چکا تھا۔ ببّو اور امجد بڑی دیر اس کھیل میں کھوئے رہے۔

درخت جب زمین میں اچھی طرح جم چکا تو امجد اپنی مُنّی اور !چھُنّی ، مچھلیوں کی خبر لینے چلا گیا۔ وہ تالاب پر بڑی دیر بیٹھا مچھلیوں سے کھیلتا رہا۔ انہیں دانہ کھلاتا رہا اور ان سے من مانی باتیں کرتا رہا۔ جب وہ ان کو کھلا چکا تو گھومتا گھماتا احمد کے مکان کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد تالاب کے کنارے بڑھیا نانی، مُنّی اور ببّو کے ساتھ نمودار ہوئی۔ وہ تالاب کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ دونوں مچھلیاں سیڑھی کے قریب آ کر تیرنے لگیں۔ ببّو کو دیکھ کر مچھلیاں پانی کے اوپر اچھلنے لگیں۔ بڑھیا مچھلیوں کو دیکھ کر لپک کر بڑھی اور بولی۔

"ارے پکڑنا۔ ارے پکڑنا"

یہ کہتی ہوئی بڑھیا تالاب میں اُترنے لگی۔ ببّو نے اسے روکا کہ یہ مچھلیاں مت پکڑو۔ یہ امجد بھیّا کی پالتو مچھلیاں مُنّی اور چھُنّی ہیں۔ اس پر بڑھیا بگڑ کر بولی۔

"امجد پر خدا کا قہر ٹوٹے۔ کیا اس کے باپ کا تالاب ہے۔"

بڑھیا پانی میں آگے بڑھتی گئی۔ مچھلیاں ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور بڑھیا کمر بھر پانی میں رُک گئی۔ اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے۔ جب وہ پانی سے باہر نکلی تو اس نے ببّو کو ڈانٹا کہ اس نے شور کر کے مچھلیوں کو بھگا دیا۔ ببّو بولا کہ ان مچھلیوں کو سوائے امجد بھیّا کے اور کون پکڑ سکتا ہے۔ یہ تو انہیں کے حکم پر چلتی ہیں۔ اس بات کو سُن کر بڑھیا کے تن بدن میں اور زیادہ آگ لگی اور اس نے پکا فیصلہ کر لیا کہ ان مچھلیوں کو جب تک ہنڈیا میں نہیں پکائے گی وہ چین کا سانس نہ لے گی۔

اس کے بعد تینوں گھر واپس آ گئے۔ بڑھیا نے چولہے میں آگ جلائی اور کھانا پکانے لگی۔ بھابھی بھی وہیں بیٹھی ہوئی آٹا گوندھنے میں مصروف

تھی۔

مُنّی اس وقت باہر صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں باہر سے امجد آتا ہوا دکھائی دیا۔ امجد سے مُنّی بہت زیادہ ڈرتی تھی۔ کیونکہ نانی نے اسے منع کیا تھا کہ وہ امجد کے ساتھ نہ کھیلا کرے۔ مُنّی نے ڈر کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں سوائے امجد کے اور کوئی نہ تھا۔ امجد کے ہاتھ میں ایک موٹا سا گنّا تھا جسے وہ چوس رہا تھا۔ امجد بھی آ کر مُنّی کے پاس چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گنّے کو توڑ کر اس نے مُنّی کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”لے مُنّی تو بھی چوس۔“

مُنّی نے ڈرتے ڈرتے گنّا لے لیا۔ اس کے بعد امجد بولا۔ ”کیوں مُنّی؟ تجھے گانا آتا ہے؟“

مُنّی چپ چاپ بیٹھی رہی، منہ سے کچھ نہ بولی۔

”کیوں ری مُنّی، تجھے گانا آتا ہے؟“

مُنّی نے اس طرف سر ہلا کر ہاں کہا۔

"تو گا!" مُنّی چپ بیٹھی رہی۔

"میں کہتا ہوں گا! گا!"

اور وہ گنّے کو اُٹھا کر ہوا میں لہرانے لگا۔ مُنّی ڈر گئی اور ہلکے سروں میں گانے لگی۔

"جمنا کنارے کہیں باجے رے۔ بانسریا!

بانسری کی تان سن لٹ گئی ری گوئیاں!

میں مٹ گئی ری گوئیاں!

جمنا کنارے کہیں باجے رے۔ بانسریا!"

ابھی مُنّی نے گانا ختم بھی نہ کیا تھا کہ اندر آنگن سے نانی کے پکارنے کی آواز آئی۔

"ارے مُنّی! آکر کھانا کھالو۔"

مُنّی اور امجد دونوں اندر چلے گئے۔ ببّو سامنے بیٹھا کھا رہا تھا۔ امجد اور مُنّی کا کھانا بھی سامنے رکھ دیا گیا۔

ابھی امجد نے پہلا ہی لقمہ حلق کے نیچے اتارا تھا کہ اس کا گلا مرچ کی لہروں سے جلنے لگا۔ ادھر مُنّی اور ببّو کی آنکھوں اور ناکوں سے پانی جاری ہو گیا اور دونوں کھانسنے لگے۔ امجد سے ایک دم برداشت نہ ہوا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا۔

"ارے باپ رے مر گیا۔ مر گیا۔"

بھابھی دوڑی ہوئی امجد کے پاس آئی اور بولی۔ "کیا ہوا ارے امجد؟"

امجد بولا۔ "بھابھی یہ بڑھیا مار ڈالے گی مجھے۔ دیکھو کتنی مرچ اس نے جھونک دی ہے۔"

بھابھی نے ایک لقمہ خود کھا کر دیکھا پھِر ماں کی طرف مُڑ کر بولی۔

"اماں! تم کھانا مت پکایا کرو۔ یہ کام میں خود کر لوں گی۔ بچّے تو دو ہی دم

میں بیمار ہو جائیں گے۔"

بڑھیا بولی۔ "بس تم تو اپنے دیور کو سر چڑھانے لگیں۔ اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ میرا یہاں گزر ہونا مشکل ہے۔"

بھابھی کہنے لگی۔ "بس آج سے کھانا میں خود پکایا کروں گی۔ تمہیں تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔"

بڑھیا نے زیادہ مرچ تو امجد ہی کی وجہ سے ڈالی تھی۔ اسے اپنی تدبیر میں ناکامی کی وجہ سے اور زیادہ غصہ آگیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ بس چاہے کچھ بھی ہو آج لیموں کا درخت تو اس ضِد میں ضرور اکھاڑ کر پھینک دے گی۔

رات کو جب سب لوگ سو گئے تو اس وقت بڑھیا چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی کہ جب سارے لوگ سو جائیں تو وہ اُٹھ کر اپنا کام کرے اور درخت کو اُکھاڑ پھینکے۔ امجد اور ببّو ایک ساتھ چارپائی پر سوئے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ہی بھابھی بھی سو رہی تھی۔ بھیّا بھی اپنے کمرے میں

پڑے سو رہے تھے۔

مُنّی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ بڑھیا جب انتظار کر کر کے تھک گئی تو اس نے مُنّی کو ڈانٹا۔

"کیوں ری، آنکھ پھاڑے کیا دیکھ رہی ہے۔ نیند نہیں آرہی؟ سو جا۔"

مُنّی نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑھیا اٹھی اور چپ چاپ دروازہ کھول کر آنگن کی طرف چلی گئی۔ مُنّی کو شک پیدا ہوا کہ نانی ضرور درخت کو اکھاڑنے آنگن میں گئی ہوئی ہے۔ مُنّی بھی بستر سے اٹھی اور دبے پاؤں دروازے سے جھانک کر دیکھنے لگی۔ نانی پوری طاقت سے درخت کو اکھاڑنے میں مصروف تھی۔ تمام طاقت لگانے کے بعد بڑھیا درخت کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اکھاڑ کر درخت کو ایک طرف پھینک دیا اور گھڑے میں سے پانی نکال کر اس طرح پی رہی تھی جیسے کلیجہ ٹھنڈا کر رہی ہو۔

مُنّی نانی کو واپس آتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے بستر پر چلی گئی اور آنکھ

موند کر سونے لگی۔ بڑھیا آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ مُنّی کو اس بات کا بہت دکھ ہوا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی نانی نے کوئی بہت بُرا کام کیا ہے۔ مُنّی بڑی دیر تک انہی باتوں کو سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے آخر اسے نیند آگئی۔

مُنّی اور ! چھُنّی کا خاتمہ

صبح سویرے جب بھابھی کی آنکھ کھلی اور کمرے سے باہر نکل کر آئی تو اس نے سب سے پہلے اکھڑا ہوا درخت دیکھا اور اس کا کلیجہ یک دم دھک سے ہو کر رہ گیا۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ کام اس کی ماں کا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً کمرے میں ماں کے پاس پہنچی اور اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ بڑھ

یا اٹھتی ہوئی غرّا کر بولی۔ ”کیا بات ہے بیٹی ؟“

بھابھی نے غصّے سے کہا۔ ”یہ درخت رات کو تم نے اکھاڑا تھا؟“

''ہاں تو کیا قیامت آگئی؟'' بڑھیا گرج کر بولی۔

بھابھی بولی۔ ''تم جانتی ہو کہ امجد کتنا ضدّی لڑکا ہے۔ اب خواہ مخواہ ایک لڑائی پیدا ہو گئی۔''

بڑھیا بولی۔ ''تم اپنے دیور کا اتنا پارٹ کیوں لیا کرتی ہو؟ کیا وہ تمہارا کوئی لگتا ہے؟ وہ تو غیر لڑکا ہے۔ وہ تو بھائی کی آدھی جائیداد کا حصّے دار ہے۔''

بھابھی بولی۔ ''امجد کو میں نے بچپن سے لے کر اب تک پالا ہے۔ مجھے اس سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اپنے بچے ببّو سے۔ میرے علاوہ اس کا اور کون ہے؟ میں اسے ہرگز غیر نہیں سمجھوں گی۔''

آدھے گھنٹے تک بھابھی اور بڑھیا میں اسے طرح لڑائی ہوتی رہی اور آخر بھابھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور چادر میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔

امجد نے جب اکھڑے ہوئے درخت کو دیکھا تو غصّے میں آگ بگولا ہو گیا اور سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اسے لاکھ کوئی سمجھاتا مگر وہ چُپ نہ ہوتا اور اسی

طرح غصّے میں بڑبڑاتا رہتا۔

"یہ بڑھیا۔ خدا اسے غارت کر دے۔ ہر دم میرے پیچھے لگی رہتی ہے۔ میں نے اس بڑھیا کا کیا بگاڑا ہے۔ آخر اسے مجھ سے کیوں ضد ہے۔"

بڑھیا بھی سامنے چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔ پر منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ کیونکہ لڑائی بڑھنے کا خطرہ تھا اور امجد اس دن بغیر کھائے پیئے ہی اسکول چلا گیا۔ بھابھی نے بھی اس دن ناشتہ نہ کیا اور وہ اسی طرح چپ چاپ لیٹی آنسو بہاتی رہی۔ بھابھی کو امجد سے بے حد محبت تھی اور اس کا دل توڑنا اسے کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔

امجد کے اسکول جانے کے بعد بھیّا بھی دفتر کی تیاری کر رہے تھے۔ بڑھیا نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے اور اسی وقت امجد کے بھیّا سے اس بات کی شکایت کرنی چاہیے۔ چنانچہ دونوں آنکھوں میں پانی لگا کر امجد کے بھیّا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ امجد کے بھیّا نے جب بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو وہ حیران ہوئے اور بولے۔ "کیا بات ہے، آپ رو کیوں رہی

ہیں؟"

بڑھیا آنکھوں کا پانی آنچل کے پلو سے پونچھتی ہوئی رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "بیٹا! میری تو قسمت میں رونا لکھا ہے۔ روؤں نہ تو کیا کروں۔ تمہارے چھوٹے بھائی نے آج میرے سو سو نتیجے کیے ہیں۔ مجھے تو گھر ہی بھجوا دو واپس۔ جیسے بھی ہو گا وہیں گزارہ کر لوں گی۔ مگر یہاں کسی کی گالی اور بات سہی نہیں جاتی۔"

امجد کے بھیّا اسی وقت غصّے میں بھرے ہوئے بھابھی کے پاس پہنچے اور بولے۔ "تم نے سنا، امجد کی شوخی اور شرارت سے میرا ناک میں دم آ گیا ہے۔ ہر وقت کوئی شرارت یا بد معاشی۔ میں اس کا حصّہ آج ہی علیٰحدہ کر دوں گا۔ اب میرا اس کے ساتھ گزر نہیں ہو سکتا۔"

بھابھی بھی چارپائی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "اب آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لایئے گا۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ وہ لڑکا سبھوں کی آنکھ کا کانٹا ہے۔ میں ایسی باتوں میں نہیں آتی۔ آپ اپنا گھر سنبھالئے۔ مجھ سے

نہیں ہوتا۔"

امجد کے بھیّا بولے۔ "تم ہی نے تو اسے اس طرح سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

بھابھی بولی۔ "بچہ ہے۔ کوئی عقل والا تو نہیں۔"

بات آئی گئی ختم ہو گئی مگر بڑھیا کے دل میں جو کینہ بھرا ہوا تھا اس کی آگ اسے پھونکے ڈالتی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ کسی نہ کسی طرح اس لونڈے کی باتوں کا بدلہ ضرور لوں گی۔ چنانچہ جب شام کو امجد کے بھیّا گھر واپس آئے تو اس وقت بڑھیا لڑائی کے لیے ریہرسل کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ بھیّا کے دفتر سے آتے ہی بڑھیا نظر بچا کر کمرے میں چلی گئی اور بولی۔ "بیٹا، ببّو اب پانچ سال کا ہو گیا۔ اس کی بسم اللہ نہیں کراؤ گے؟"

امجد کے بھیّا بولے۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔" اتنے میں بھابھی بھی کمرے میں پہنچ گئیں۔ بھائی، بھابھی کو موجود پا کر بولے۔ "کیوں ببّو کی اماں۔ ببّو کی بسم اللہ بھی تو کرانی ہے۔"

بھابھی نے کہا۔ ”اگر آپ کی مرضی ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔“

اس پر بڑھیا بولی۔ ”میں نے سوچا ہے کہ بسم اللہ کے موقعے پر پڑوسیوں کو ایک دعوت بھی دے دی جائے اور اس کے لیے میں نے چار پانچ گھر بلاوے بھی بھیج دیے ہیں۔“

بھیّا یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“

بڑھیا بولی۔ ”بس اب اس میں دیر نہیں کرنی ہے۔ کل ہی اس کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔“

تینوں راضی ہو گئے اور دعوت کی فہرست بنائی گئی۔ محلے کے تین چار آدمیوں کا نام چنا گیا اور کمرے کی جھاڑ پونچھ اور آرائش ہونے لگی۔ ببّو کے لیے رنگ رنگ کے کھلونے خریدے گئے۔ نئے نئے کپڑے بنائے گئے اور گھر میں تمام رنگ برنگ کی قندیلیں روشن ہوئیں۔

جب ببّو اور امجد کو پتا چلا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے اور ناچنے لگے۔ مُنّی

بھی بہت خوش تھی اور جب سارا سامان تیار ہو گیا تو اب کل صبح کو بسم اللہ
کی رسم ادا کی جانے والی تھی۔ جب ببّو اور امجد دونوں ساتھ ساتھ سونے کو
چارپائی پر گئے تو آپس میں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر باتیں
کرتے کرتے دونوں سو گئے۔ صبح سویرے جب دونوں کی آنکھیں کھلیں تو
گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ تمام دیواروں پر مزدور سفیدی کر رہے تھے اور
آنگن میں ایک بکری بھی بندھی ہوئی تھی۔ بکری کو دیکھ کر امجد اور ببّو
دونوں دوڑے ہوئے آنگن میں پہنچے اور بکری کے ساتھ کھیلنے لگے۔ وہ
دونوں بکری کے اوپر ہلکے ہلکے ہاتھ پھیرتے رہے۔ اسے بہت سی درختوں
کی پتیاں توڑ کر کھانے کو دیں اور کوئی گھنٹہ بھر وہ بکری سے کھیلتے رہے۔
آخر جب کھیل کر وہ پوری طرح سیر ہو گئے تو امجد نے جلدی جلدی اسکول
جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ ناشتے میں بھی اس
دن بڑی اچھی اچھی چیزیں پکی تھیں۔ ناشتہ کر کے بھیّا دفتر چلے گئے اور امجد
اپنے اسکول کو روانہ ہو گیا۔

جب امجد اسکول چلا گیا تو بڑھیا کو سکون ہوا اور وہ گھر سے نکل کر ایک طرف کو نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آئی تو ایک قصائی اور ایک ملّاح اس کے ساتھ تھے۔ بڑھیا ملّاح سے بڑی دیر تک باتیں کرتی رہی اور اسے تالاب کا راستہ بتا کر بولی کہ وہاں دو مچھلیاں ہیں، وہ انہیں پکڑ لائے لیکن ملّاح کسی طرح راضی ہونے میں نہیں آتا تھا کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ دونوں مچھلیاں امجد کی پالی ہوئی مُنّی اور! چھُنّی ہیں اور ان کو پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھر بیٹھے نئی آفت مول لے گا۔ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہ مچھلیاں تو نہیں البتہ دوسری مچھلیاں پکڑ کر لا سکتا ہے۔ لیکن بڑھیا کو تو محض وہی مچھلیاں چاہئے تھیں۔ وہ انہیں کے لئے تو یہ سارا دعوت وغیرہ کا ڈھونگ رچا رہی تھی۔ آخر بڑھیا نے ملّاح کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیا اور بولی کہ ابھی ابھی مچھلی پکڑ لائے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ ذمہ دار ہو گی۔

ملّاح بھی روپے دیکھ کر لالچ میں آ گیا اور چپ چاپ جال کو لے کر تالاب

کی طرف روانہ ہو گیا۔ بھری دوپہر کا وقت تھا۔ سورج ٹھیک سر کے اوپر چمک رہا تھا اور مچھلیاں پانی کے اندر ٹھنڈ میں آرام کر رہی تھیں۔ ملّاح نے سنّاٹا پا کر آخر تالاب میں جال پھینک ہی دیا اور درخت کے نیچے سستانے کو بیٹھ گیا۔

ابھی وہ درخت کے نیچے بیٹھا ہی تھا کہ سامنے اسکول کی طرف سے امجد آتا ہوا دکھائی دیا۔ ملّاح کے تو ہوش اُڑ گئے اور وہ سمجھا کہ اب خیریت نہیں ہے۔ امجد جب تالاب کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تالاب میں جال پڑا ہوا ہے۔ وہ بھاگا ہوا جال کے پاس پہنچا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ ملّاح چپ چاپ درخت کے نیچے دُبکا ہوا بیٹھا رہا لیکن امجد کی تیز آنکھوں نے اسے فوراً پہچان لیا اور وہ جال کو ہاتھ میں لیے ہوئے اس کے پاس پہنچا اور بولا۔ ''کیوں بے۔ یہ جال تو نے میرے تالاب میں کیوں پھینکا؟''

ملاح کانپنے لگا اور بولا۔ ''امجد بابو معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں آپ کے یہاں جو بڑھیا آئی ہے، اس کے بہکانے میں آکر یہ غلطی کر بیٹھا۔

اب میری توبہ ہے جو آئندہ میں جال پھینکوں۔"

امجد بولا۔ "میں معاف نہیں کرنے کا۔"

اور یہ کہہ کر اس نے اپنا چھُرا نکالا اور جال کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ ملّاح منّتیں کرتا رہا۔ لیکن امجد جال کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹتا رہا۔ جب جال کٹ چکا تو وہ بولا۔ "لے۔ اب جا کر مچھلیاں پکڑ۔"

یہ کہہ کر امجد دوبارہ اسکول واپس چلا گیا اور ملّاح اپنی لالچ پر پچھتانے لگا کہ محض پانچ روپے کی خاطر وہ جال کھو بیٹھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے روزی کمانے کا سہارا صرف یہی جال تھا۔ اب تو وہ روزی بھی نہ کما سکے گا اور اس کے بچے بھوکے مرنے لگیں گے۔ وہ یہی سوچتا ہوا امجد کے گھر کی طرف چلنے لگا اور وہاں پہنچ کر اس نے بڑھیا کو سارا قصّہ سنایا۔ بڑھیا یہ سن کر غصّے سے کانپ اٹھی اور بولی۔

"تو اتنے سے چھوکرے سے کیوں ڈر گیا۔ وہیں اسے پکڑ کر مارنا تھا۔"

ملّاح بولا۔ ”امجد بابو پر میں ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔“

بڑھیا نے ایک اور چال چلی۔ اس نے پوچھا کہ جال کتنے میں مل جائے گا۔ ملّاح بولا کہ دس روپے میں جال مل جائے گا۔ میں غریب آدمی خواہ مخواہ میں مارا گیا۔ بڑھیا نے فوراً اس کے ہاتھ میں دس روپے رکھ دیے اور بولی اب خالی ہاتھ آیا تو سمجھ لینا۔ ملّاح نے دس روپے لے لیے کیونکہ اسے جال خریدنا تھا اور اگر وہ جال نہ خریدتا تو اس کے بیوی بچوں کو بھوکے مرنے کی نوبت آجاتی۔

وہ وہاں سے سیدھا بازار گیا اور ایک مضبوط اور نیا جال خرید لایا۔ جب وہ بازار سے لوٹا تو شام ہو چکی تھی۔ راستے میں تالاب پڑتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تمام سناٹا تھا اور مچھلیاں پانی کے اوپر کلیل کر رہی تھیں۔ اس نے تیزی کے ساتھ جال کو پانی میں پھینک دیا۔ مچھلیاں جال کے اندر آ گئیں۔ وہ سیدھا جال کھینچ کر امجد کے گھر پہنچا اور مچھلیوں کو بڑھیا کے حوالے کرتے ہوئے بولا کہ میرا نام نہ لینا کہ میں نے مچھلیاں پکڑی ہیں۔

یہ کہہ کر ملّاح تو چلتا بنا اور بڑھیا مچھلیوں کو لے کر اندر پہنچی۔ اس وقت بھابھی دعوت کا کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ وہ بڑھیا کو مچھلیاں تھامے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئی اور تڑپ کر اُٹھی اور دونوں مچھلیاں جھپٹتی ہوئی بولی۔ ”یہ تو امجد کی مُنّی! چھُنّی مچھلیاں ہیں۔ ماں! تم نے کیا غضب کیا؟“

بڑھیا گھبرا کر بولی۔ ”اے ہے تو کیا ہوا، امجد کی مچھلیاں دیکھنے کو ہیں؟ تالاب میں ہزاروں مچھلیاں ہوتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم اس میں امجد کی کون ہیں اور کون نہیں۔“

بھابھی بولی۔ ”ماں تم نے یہ بہت برا کیا۔ امجد رو رو کر ان مچھلیوں کے لیے جان دے دے گا۔ گاؤں کا بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ مچھلیاں امجد نے پالی ہیں۔ آج تک کسی کو انہیں پکڑنے کی ہمّت نہیں ہوئی۔“

مچھلیاں زمین پر پڑی ہوئی تھیں اور خشکی میں بے چاری مر چکی تھیں۔ دونوں مچھلیاں آپس میں بھائی بہن لگتی تھیں۔ بالکل ایک ہی جیسا ناک نقشہ تھا، ہو بہو ایک جیسی لگتی تھیں۔ بھابھی نے کھانا پکانا بند کر دیا اور بولی۔

"ہماری ہنڈیا میں یہ مچھلیاں نہیں پک سکتیں۔"

اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ شام کو امجد اسکول سے واپسی پر ایک بار پھر تالاب کی طرف گیا اور مُنّی ! چھُنّی کے لیے بہت سے چنے بھی لیے ہوئے تھا۔ تالاب کے کنارے پہنچ کر اس نے مخصوص آواز میں سیٹی بجائی مگر اس کی آواز پر مچھلیاں ں نہیں نکلیں۔ امجد کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ وہ تالاب میں کود پڑا اور اِدھر اُدھر تیرتا ہوا اپنی پیاری مچھلیوں کو ڈھونڈنے لگا۔ مگر وہاں مچھلیاں تھیں کب۔ وہ تو جال میں پھنس کر دم توڑ چکی تھیں۔ امجد تالاب سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے ببّو دوڑا ہوا آتا دکھائی دیا۔ امجد فوراً ببّو کی طرف بڑھا۔ ببّو نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس سے کہا۔ "امجد بھیّا! تمہاری مُنّی اور ! چھُنّی کو نانی نے مار دیا۔"

امجد طوفان کی طرح بھاگا ہوا گھر آیا۔ بر آمدے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ بھابھی بھی وہیں پر کھڑی تھی۔ امجد نے مری ہوئی مُنّی اور ! چھُنّی کو دیکھا اور بھابھی کے پاؤں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگا۔ ”بھابھی ان بے زبان مچھلیوں نے کیا بگاڑا تھا؟ انہیں کیوں مار ڈالا۔ تم نے جن ہاتھوں سے انہیں مارا ہے، میرا بھی گلا گھونٹ دو۔“

بھابھی کے پاؤں پر وہ ابھی تک سر رکھے رو رہا تھا۔ بھابھی کی آنکھوں سے تو جیسے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈنے والا تھا اور وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”امجد بھیّا! اپنا سر میرے پاؤں سے ہٹا لے۔“ بھابھی رونی آواز میں بولی۔

امجد کہنے لگا۔ ”لو تم اب میرا سر بھی اپنے اسی پاؤں سے کچل دو۔ تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔“

بھابھی نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔ ”میرا بھیّا۔“ اور خود بھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سارے مکان میں جیسے موت کا سنّاٹا طاری تھا۔ صبح صبح جو گھر میں رونق اور چہل پہل تھی، وہ اب موت کا نوحہ بن گئی تھی اور جب مہمانوں نے امجد کی مشہور و معروف مچھلیوں کے قتل کی خبر سنی تو سب لوگ آنکھوں میں آنسو لیے گھر لوٹ

بٹوارہ

امجد اس دن کے بعد کچھ ایسا اداس ہوا کہ وہ ہنسنے بولنے کا نام ہی نہ لیتا۔ ہمیشہ چپ بیٹھا رہتا۔ اسکول کے وقت اسکول جاتا اور اسکول کے بعد واپس آ کر گھر بیٹھ جاتا۔ مچھلیاں تو اب رہی نہیں تھیں جن سے وہ چند گھڑی بات چیت کر کے دل بہلا لیتا۔ اب اسکول سے زیادہ وقت وہ گھر بیٹھا رہتا۔ اسے کھیل کود سے بھی اب اتنی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی سے بات بھی بغیر ضرورت نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب امجد کی چھٹی تھی اور بھیّا کا بھی دفتر بند تھا، وہ بھی گھر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ بھابھی کی طبیعت خراب تھی۔ امجد اٹھ کر امرود کے درخت پر چڑھ گیا اور امرود کھانے لگا۔ بڑھیا نیچے بیٹھی ہوئی بڑبڑا رہی تھی اور دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا کرے امجد درخت سے گر پڑے۔ امجد بڑھیا کو چڑانے کے لیے زور زور سے ڈالیوں کو ہلانے لگا۔

بڑھیا بولی۔ "کیسا بے شرم لڑکا ہے۔ درخت کے اوپر چڑھا بیٹھا ہے۔ خدا کرے تیری ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔"

امجد بولا۔ "زبان سنبھال کر بات کر۔ بڈھی!"

بڑھیا نے اونچی اونچی آواز میں اسے کوسنا شروع کر دیا۔ "خدا تیرا ستیاناس کرے شیطان! سارے امرود کو بھنبھوڑ ڈال رہا ہے۔"

امجد بھی تیز ہو کر بولا۔ "کیوں تیرے باپ کا درخت ہے؟"

بڑھیا نے نیچے سے ایک ڈھیلا اٹھا کر اوپر پھینکا مگر امجد کو نہ لگا۔ بڑھیا اب

زور زور سے کوسنے لگی۔ بھابھی نے جب یہ آواز سنی تو وہ اٹھ کر باہر نکلی اور آنگن میں آکر بولی۔ ”کیوں بھائی کیا جھگڑا ہے؟“

بڑھیا نے امجد کو کچھ نہ بولنے دیا بلکہ خود ہی بولنے لگی۔ ”دیکھو بیٹی۔ میں اس سے کہہ رہی تھی راجہ بھیّا درخت پر مت چڑھ۔ نیچے آجا۔ پاؤں پھسل گیا تو خدانخواستہ موچ آجائے گی۔ تو یہ اوپر سے کہتا ہے کہ کیوں اتروں؟ تیرے باپ کا درخت ہے؟“

بھابھی نے امجد سے پوچھا۔ ”کیوں امجد؟“

امجد بولا۔ ”بھابھی یہ بڑھیا جھوٹ کہتی ہے۔“

بڑھیا بولی۔ ”دیکھو تو مجھے بڑھیا کہہ رہا ہے۔ آگ لگے اس بدزبان کی منہ میں۔“

بھابھی بولی۔ ”کیوں رے آج گھر میں پڑھے گا نہیں، چھٹی ہے تو اس کا کیا مطلب کہ تو شرارتیں کرے گا؟“

امجد بولا۔ ”بھابھی میرے پیٹ میں درد ہے۔“

بھابھی بولی۔ ”اور یہ کچے امرود کھا کر پیٹ کے درد کا علاج کر رہا ہے؟“

امجد چپ ہو گیا تو بڑھیا بولی۔ ”اس کم بخت کو گھر سے نکلوا نہ لوں گی، اس وقت تک میرا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہو گا۔“

امجد کو سخت غصہ آیا۔ اس نے ایک کچا امرود وہیں سے کھینچ کر بڑھیا کے سر پر مارا، لیکن امرود بجائے بڑھیا کو لگنے کے بھابھی کے سر پر جا لگا اور وہ وہیں درد کے مارے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا نے ہنگامہ کر کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور چلّانے لگی۔ ”ہائے میری بیٹی۔ ہائے میری بیٹی کو مار ڈالا۔“

امجد فوراً درخت سے کود کر نیچے آیا اور بھابھی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اتنے میں بڑھیا ایسے زور سے چیخی کہ امجد کے بھیّا بھی باہر سے بھاگے ہوئے اندر آئے۔ امجد بھیّا کو دیکھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ بھابھی کو بھیّا اور نانی دونوں اٹھا کر کمرے کے اندر لے گئے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر خود اندر نمودار ہوا اور بولا کہ اسے امجد نے ابھی

فوراً دوا دینے کا حکم دیا ہے۔ ڈاکٹر نے بیگ کھول کر دوا نکالی اور بھابھی کو پلائی۔ دوا پیتے ہی بھابھی فوراً ہوش میں آ گئی۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد بھیّا نے بھابھی سے کہا. "آج سے ہمارا اور امجد کا کوئی واسطہ نہیں۔ تمہیں میرے سر کی قسم جو تم نے اسے کھانے پینے کو دیا۔ کل صبح سے اس کا کھانا پینا، رہنا سہنا بالکل الگ کر دو۔"

یہ کہہ کر بھیّا غصّے سے باہر نکل گئے۔ اس دن رات کو کافی دیر کے بعد جب امجد لوٹا تو اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ بھابھی کے پاس گیا اور بولا۔ "بھابھی مجھے بھوک لگی ہے۔"

بھابھی اسی طرح بستر پر لیٹی رہی اور بولی۔ "خود سے نکال کر کھالے۔"

امجد ضد کرنے لگا۔ "نہیں تم مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤ گی تو میں کھاؤں گا ورنہ نہیں۔"

بھابھی نے کہا۔ "میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔"

اس پر بڑھیا بنّو سے بولی۔ ”بنّو آج تیرے ابّا نے کیا کہا تھا امجد سے کہنے کو؟“

بنّو بولا۔ ”ابا نے کہا تھا کہ امجد بھیّا کا آج کی تاریخ سے۔۔۔“

بنّو بولتے بولتے رُک گیا اور نانی سے پوچھنے لگا۔ ”اس کے بعد کیا کہا تھا نانی؟“

نانی نے مُنّی کو کہا۔ ”مُنّی! تو کہہ دے۔“

مُنّی نے بولنے کی کوشش کی۔ ”آج کی تاریخ سے امجد بھیّا کا گھر میں چلنا پھرنا۔۔۔“

مُنّی بھی بھول گئی اور نانی سے پوچھنے لگی۔ ”نانی اماں! اس کے بعد کیا تھا؟“

نانی نے غصّے سے جھنجھلا کر کہا۔ ”ہٹ تجھے تو کوئی بات ہی یاد نہیں رہتی۔“

اس کے بعد امجد سے بولی۔ ”دیکھو میاں امجد! تمہارے بھائی نے کہا ہے کہ آج کی تاریخ سے تمہارا ہمارے یہاں آنا جانا، چلنا پھرنا، بولنا بتیانا بالکل

بند۔"

امجد کہنے لگا۔ "کیوں؟ کیوں بند! جیسا بھیّا کا گھر ویسا میرا گھر۔ کیا ہمارا اور بھیّا کا گھر الگ الگ ہے۔"

بڑھیا بولی۔ "ہاں آج سے گھر کا بٹوارہ ہو گیا ہے سامنے والا حصّہ تمہارا ہے اور یہ حصّہ ہمارا ہے۔ تم آج سے اپنے ہی حصّے میں سوؤ گے۔"

امجد اُٹھ کر چلا گیا اور سامنے والے حصّے میں جو کمرہ تھا اس میں کھاٹ پر لیٹ گیا۔ بھابھی نے مُنّی سے کہا کہ وہ امجد کا کھانا لے کر اسے دے دے۔ جب مُنّی امجد کا کھانا لے کر کمرے میں گئی تو امجد نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "ہٹا لے جا کھانا۔ میں نہیں کھاتا۔"

مُنّی نے کہا۔ "امجد بھیّا۔ کھالو۔"

امجد تڑپ اٹھا اور بولا۔ "میں کہتا ہوں نکل، نکل یہاں سے۔"

مُنّی ڈر کر واپس نکل آئی اور بھابھی سے بولی۔ "خالہ، امجد بھیّا کھانا نہیں

کھاتے۔"

بھابھی سانس بھر کر بولی۔ "وہ تو ہمیشہ میرے ہی ہاتھوں سے کھاتا ہے، وہ کبھی نہیں کھائے گا۔"

بڑھیا بولی۔ "بیٹی، ہوش کی دوا کرو۔ تمہیں ببّو کے ابا نے سر کی قسم دے دی ہے کہ تم اسے کھانا نہ کھلاؤ گی۔"

بھابھی بولی۔ "ہاں تو وہ رات بھر بھوکا رہے گا۔"

"رہا کرے بھوکا۔ شیطان لڑکا ہے کہیں سے کچھ چُرا کر کھالے گا۔"

بھابھی چپ ہوگئی۔ اس کا بات کرنے کو جی نہیں چاہا۔

میل ملاپ

صبح کو جب امجد کی آنکھ کھلی تو اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں بھی سوج گئی تھیں، وہ بستر سے بمشکل اٹھا اور کمرے کے باہر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ سامنے بھیّا اپنے کمرے میں حسبِ معمول دفتر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بھابھی شاید اندر کمرے میں تھیں کیونکہ باہر سے نظر نہیں آتی تھیں۔ مُنّی اور ببّو چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

امجد اس وقت تک سیڑھی پر بیٹھا رہا جب تک بھیّا دفتر نہ چلے گئے۔ بھیّا

جب دفتر جا چکے تو اس نے سیڑھی پر بیٹھے ہوئے پکار کر کہنا شروع کیا۔ ”بڑے آئے بھائی صاحب۔ مجھے علیٰحدہ کر دیا، کون ہوتے ہیں وہ مجھے علیٰحدہ کرنے والے۔ مجھے بھابھی نے کیوں علیٰحدہ نہیں کیا۔ بھابھی بولتی کیوں نہیں۔ چلو مت بولو۔ ہم سے کوئی نہ بولے۔ کوئی بولے یا نہ بولے، میں تو بولوں گا۔ میں اکیلے اپنا کھانا پکاؤں گا۔ مجھے کھانا پکانا خوب آتا ہے۔“

بھابھی یہ باتیں کمرے میں لیٹی ہوئی سُن رہی تھی لیکن اس سے تکلیف کے مارے اٹھا نہ جاتا تھا۔ اس نے مُنّی سے کہلا بھیجا کہ تمام کھانے پکانے کا سامان اس کے کمرے میں پہنچا دیا اور نوکرانی بھیج دی ہے، وہ اس سے پکوا لے۔ امجد چِڑ گیا اور بولا۔ ”میں الگ کھانا نہیں کھاؤں گا۔ تم لوگوں کا دل چاہے تو کھالیا کرو۔“

بڑھیا نے منہ بنا کر کہا۔ ”نہیں کھائے گا تو بھوکوں مرے گا۔ دوسروں کا کیا لے گا۔“

بھابھی یہ سن کر بولی۔ ”ماں۔ شرم کرو۔ اکیلے بچے کا دل گھبرا جائے گا۔ تم

کیوں اسے کوس رہی ہو۔ بے ماں کا بچہ ہے۔"

امجد تھوڑی دیر کے بعد باہر نکل گیا۔ اس کا آج کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسے ہر چیز سے نفرت ہو گئی تھی۔ اکیلے کمرے میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ اٹھ کر پہلے باغ کی طرف گیا۔ پھر تالاب کی طرف گیا۔ وہاں اس کا دل بھر آیا اور وہ زیادہ گھبرانے لگا۔ اسی طرح وہ بڑی دیر تک گاؤں کے چکر کاٹتا رہا۔ آخر تھک ہار کر وہ پھر گھر واپس لوٹ آیا اور کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اسی طرح وہ چپ چاپ کھاٹ پر لیٹا رہا۔ اتنے میں اسے نیند آگئی اور شام تک سوتا رہا۔

شام کو جب اس کی آنکھ کھلی تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس نے دریچہ کھولا تو اس وقت پوری طرح اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کمرے میں اکیلا بیٹھا آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔

بھیّا دفتر سے آچکے تھے۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کھانے کے لیے چولھے کے پاس پہنچے، بڑھیا نے آج رنگ برنگ کی ترکاریاں پکائی تھیں۔ وہ

بہت سا کھانا لے کر سامنے آئی اور ان کے آگے رکھ دیا۔ بھیّا ہاتھ دھو کر جب کھانے کو بیٹھے تو ان کی نگاہ امجد کے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں اندھیرا تھا، بھیّا بولے۔ ''آج امجد کے کمرے میں اندھیرا ہے۔ کیا لوٹ کر نہیں آیا ابھی تک؟''

بڑھیا بولی۔ ''ارے کھلواڑ نکھٹّو لونڈوں کا کیا کہنا ہے۔ کہیں مارا پھر رہا ہو گا۔ صبح سے بھوکا پیاسا کہیں سر جلا رہا ہو گا۔''

بھیّا کھانا کھائے بنا اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے ایک لقمہ تک نہ کھایا اور وہ کس طرح کھا سکتے ہیں۔ امجد آخر ان کا چھوٹا بھائی ہی تو تھا۔ بھابھی الگ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور بیمار تھی۔ بڑھیا اور مُنّی دونوں آنگن میں چولہے کے پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور بڑھیا امجد کے نکل جانے کی وجہ سے بے حد خوش خوش نظر آتی تھی۔ اب اس کی راہ کا کانٹا نکل چکا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کر رہی تھی۔

جب بُڑھیا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو بھابھی آہستہ سے اٹھی اور اِدھر آ کر اس نے امجد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ ایک چراغ تک نہیں جل رہا تھا۔ بھابھی کو ہلکے ہلکے اندر سے رونے کی آواز آئی۔ اس کا دل گھبرانے لگا اور وہ آخر امجد کے کمرے کے بالکل قریب آ گئی اور اس نے کان لگا کر غور سے سنا۔ امجد آہستہ آہستہ سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ بھابھی نے بالکل رونی آواز میں آہستہ سے پکارا۔ ”امجد بھیّا!“

امجد کی سسکی یک دم بند ہو گئی اور وہ دروازے پر لپک کر پہنچا اور پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا بولا۔ ”بھابھی تم نے مجھے علیٰحدہ کر دیا نا۔ میں بھی اب اس گاؤں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میرا اب یہاں کوئی نہیں ہے۔“

بھابھی نے ہاتھ بڑھا کر آنچل سے اس کے آنسو پونچھے اور بولی۔ ”بھیّا! مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟“

”ہاں سب کو چھوڑ کر۔“

امجد یہ کہہ کر لپک کر باہر نکلا۔ ایک گٹھری بغل میں دبائے گلی سے باہر نکل گیا۔ بھابھی بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آئی اور امجد کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ امجد بہت آگے نکل چکا تھا۔ بھابھی کمزور اور بیمار تھی، اس سے بمشکل چلا جاتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔ تالاب، پھر باغ اور پھر دریا کے گھاٹ تک پہنچ گئی۔ آخر اس سے آگے نہ چلا گیا تو وہ بیٹھ گئی اور اس نے پوری طاقت سے پکارا۔ ''امجد بھیّا۔''

امجد نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو اسے بھابھی دکھائی دی۔ وہ بھاگا ہوا واپس آیا اور بھابھی سے لپٹ گیا۔ پھر دونوں لپٹ کر خوب جی کھول کر روئے اور آخر دونوں گھر واپس آئے۔

دوسرے دن بڑھیا خود ہی اپنے گھر واپس چلی گئی اور ساتھ مُنّی بھی۔ اور گاؤں بھر میں امجد کی وہی چنچل شوخی پھر سے گونج اٹھی اور سارا گاؤں پھر سے ایک دفعہ مسرت اور خوشی سے جگمگا اٹھا۔۔ دوست شاد اور دشمن خوار ہوئے۔ بھیّا نے بھی امجد کو معاف کر دیا اور اسے گلے لگالیا۔ بھابھی کی

آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور ببّو ہلکے ہلکے باجا بجائے جا رہا تھا۔

ختم شد